دسمبر ۲۰۰۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

یہود و نصاریٰ کے ایجنڈے کی تکمیل میں ہمارا کردار

ملکی سالمیت و بقا کے حوالے سے ہمارے نزدیک فی الوقت اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ اپنے ناپاک ایجنڈے کی تکمیل کی خاطر پاکستان کی فضائی اور زمینی حدود کی مسلسل خلاف ورزی کر رہا تھا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ امریکی میزائل حملوں کے نتیجے میں انسانی جانوں کا مسلسل ضیاع ہو رہا ہے۔ بے گناہ عورتیں، بوڑھے اور معصوم بچے خاک و خون میں غلطاں ہیں۔ لوگوں کی املاک تباہ ہو رہی ہیں۔ دوسری طرف خود ہماری حکومت امریکہ سے خوفزدہ اور مرعوب ہو کر اپنے ہی مسلمان شہریوں اور قبائلی علاقوں پر وحشیانہ تشدد کر رہی ہے۔ گن شپ ہیلی کاپٹرز اور مسلسل بمباری کے ذریعے گاؤں کے گاؤں ملیا میٹ کیے جا رہے ہیں۔ شر پسند عناصر کی سرکوبی کی اس مہم میں روزانہ بے شمار بے گناہ جانوں کا ہمارے ہی ہاتھوں قتل عام ہو رہا ہے۔ صرف باجوڑ کے تین لاکھ سے زائد افراد وحشیانہ بمباری سے محفوظ رہنے کے لیے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور کیمپوں میں زندگی برقرار رکھنے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ انسان چاہے کتنا ہی غریب اور نادار کیوں نہ ہو اُس وقت تک اپنا گھر بار نہیں چھوڑتا جب تک اُس کی جان کو خطرہ نہ ہو۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال انتہائی شرمناک ہے اور ریاستی جبر اور ظلم و تشدد کا بدترین مظاہرہ ہے کہ ہم طاقت کے خوف اور ڈالروں کی لالچ میں اپنے محبِّ وطن اور محبِّ اسلام بے گناہ مسلمان بھائیوں کا خون بہائیں۔ اس طرزِ عمل کے خوفناک نتائج و عواقب سے گویا ہم نے دانستہ آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

حکومت کی اس حالیہ پالیسی کے نتیجے میں نہ صرف فوج اور عوام کے درمیان نفرت کی خلیج حائل ہو چکی ہے بلکہ لشکروں کو تشکیل دے کر ہم نے قبائلی عوام میں باہم منافرت اور دشمنی کے ایسے بیج بو دیے ہیں جو نسل در نسل قتل و غارت گری کو جنم دیں گے۔ اور یوں ہم نادانستہ طور پر یہود و نصاریٰ کے اس ایجنڈے کی تکمیل کا سامان کر رہے ہیں جس کے تحت پاکستان کو مزید حصے بخرے کرنا ان کے بنیادی اہداف میں ہے اور اب انہیں اپنی کامیابی کا اتنا یقین ہے کہ وہ ایسے

نقشے بھی بلا جھجک شائع کر رہے ہیں جس میں پاکستان کا جسد پارہ پارہ نظر آتا ہے۔ لہٰذا ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ (۱) پاکستان فوری طور پر نام نہاد دہشت گردی کی جنگ سے علیحدگی کا اعلان کرے۔ (۲) امریکی میزائل حملوں کے مقابلے میں مضبوط اور باہمت موقف اور طرزِ عمل اختیار کرے۔ (۳) نیٹو افواج کے لیے سامانِ رسد کی ترسیل براستہ پاکستان بند کی جائے۔ (۴) حالیہ اقدام سے قبائلی بھائیوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں اُن کی تلافی کی جائے۔ اور قائداعظم کے قبائلیوں سے وعدہ کے مطابق وہاں سے فوج کشی ختم کر کے افواجِ پاکستان کو واپس بلایا جائے۔

ہم اس امر پر تشویش کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد کے باوجود سوات اور باجوڑ میں فوج کشی کا سلسلہ ختم نہ کرنا' نہ صرف یہ کہ موجودہ جمہوری سیٹ اپ کی کھلی توہین ہے بلکہ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ملک میں بدستور مشرف کی پالیسیوں کی حکمرانی ہے اور ہماری حکومت آج بھی پورے طور پر امریکہ کی غلام ہے۔

ہمارے نزدیک ملک وملت کو درپیش تمام مسائل کا دیرپا' پائیدار اور یقینی حل یہ ہے کہ امریکہ' بھارت' اسرائیل اور دیگر عالمی طاقتوں کے مقابلے میں کہ جو پاکستان کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے اور اس کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے پر کمربستہ ہیں' ——— کائنات کی عظیم ترین قوت کی نصرت وحمایت حاصل کرنے کی خاطر:

i) انفرادی اور اجتماعی توبہ کا اہتمام کیا جائے اور آئندہ سچے اور باعمل مسلمان کے طور پر جینے اور مرنے کا عزمِ مصمم کیا جائے!

ii) اس ملک خداداد پاکستان میں' جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا' دین حق کے قیام اور شریعت اسلامی کے حقیقی نفاذ کو پوری قوم اپنی ترجیح اول قرار دے' تاکہ پاکستان کی بقاء وسالمیت کو لاحق خطرات دور ہوسکیں اور یہ صحیح معنوں میں اسلام کا ایک قلعہ اور قائداعظم کے الفاظ میں روشنی کا مینار ثابت ہو!

بقول اقبال ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا' لوح وقلم تیرے ہیں!

۞۞۞

تذکرہ وتبصرہ

ہماری دینی ذمہ داریاں
اور
رفقائے تنظیم اسلامی کے لیے بنیادی لائحہ عمل

تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر
امیر تنظیم اسلامی محترم حافظ عاکف سعید کا اختتامی خطاب

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۷۷ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۝۷۸﴾

حضرات! سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جس کی توفیق کے سہارے ہم یہ اجتماع منعقد کر سکے۔ اجتماع کے انعقاد میں جن لوگوں نے محنت کی، وہ بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اجتماع کے منتظمین اور جان و مال کا انفاق کر کے آنے والے تمام شرکاء کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ دراصل یہ اجتماع تذکیر اور یاددہانی ہے۔ اِس کے ذریعے ہمیں اپنی باطنی بیماریوں کی اصلاح اور فکرِ تنظیم کی تازگی کا موقع ملا ہے۔ ہم جس فکر کی دعوت دے رہے ہیں یہ پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے، تاہم سورۃ الحج کی آیات ۷۷، ۷۸ کی مدد سے اس کو مختصراً سمجھا جا سکتا ہے۔ اِن آیات میں ہماری دینی ذمہ داریوں کی چار سطحیں بیان کی گئی ہیں۔

دینی ذمہ داریوں کی پہلی سطح کیا ہے‘ اِس کی بابت فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾

’’مؤمنو! رکوع کرتے اور سجدے کرتے رہو۔‘‘

یہاں نماز کا ذکر کر کے گویا ارکانِ اسلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارکان اسلام وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان کو معلوم ہیں‘ خواہ وہ اُن پر عمل کرے یا نہ کرے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ نماز فرض ہے‘ ماہِ رمضان کے روزے فرض ہیں‘ صاحبِ استطاعت پر حج فرض ہے‘ صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ فرض ہے۔ یہ ہماری دینی ذمہ داریوں کی پہلی سطح ہے‘ جس سے ہر آدمی آگاہ ہے‘ مگر افسوس کہ اس کے بعد کی تین سطحیں تو ہمارے حافظے سے ہی محو ہوگئی ہیں۔ ہمیں اِن کا شعور ہی نہیں رہا۔

دینی ذمہ داریوں کی دوسری سطح کیا ہے؟ فرمایا:

﴿وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ﴾

’’اپنے رب کی بندگی (غلامی) کرو‘‘۔

بندگی سے کیا مراد ہے؟ اس کو قرآن ایک دوسرے انداز سے واضح کرتا ہے۔ جابجا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ’’اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی‘‘۔ جب تم نے اللہ کو اپنا ربّ اور اس کے رسول ﷺ کو رسولِ برحق مان لیا تو اب لازم ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو‘ اُن کا کہا مانو۔ رسول ﷺ کی اطاعت اصل میں اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ اللہ کی بندگی نام ہے جذبۂ محبت کے ساتھ اُس کی کامل اطاعت کا‘ یعنی جس کام کے کرنے کا اُس نے حکم دیا ہے آدمی اسے انجام دے اور جس سے منع کیا ہے اس سے رک جائے۔

دینی ذمہ داریوں کی تیسری سطح کیا ہے؟ فرمایا:

﴿وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

’’اور نیکی (اور خیر) کے کام کرو‘ تاکہ تم فلاح پاؤ‘‘۔

نیکی میں بہت سے امور آتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد خدمت خلق ہے‘ یعنی دوسروں کے کام آنا‘ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر اس کی تکلیف کو رفع کرنا‘ اس کے لیے بھاگ دوڑ کرنا‘ دوسروں سے ہمدردی کرنا‘ یہ سب خدمت خلق کے کام ہیں۔ اِسی طرح بھوکے کو کھانا

کھلا دینا' کوئی قرض کے بندھن میں جکڑا ہوا ہو تو اس کی اتنی مدد کرنا کہ قرض سے نجات پا جائے' یہ بھی خدمت خلق ہے۔ غلاموں کو آزاد کرنا بھی مخلوق کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اگر آدمی مخلوق کی خدمت میں لگا ہوا ہے' اُس میں انسانی ہمدردی' ایفائے عہد اور امانت داری کے اوصاف موجود ہیں' تو گویا یہ اُس کی خاموش دعوت ہے۔ اِس کے برعکس اگر وہ دعوت دے رہا ہے لیکن انسانی ہمدردی اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے محروم ہے' اگر کوئی شخص روزمرہ زندگی میں عہد و پیمان کا پابند نہیں اور امانت داری کے معاملے میں اُس کا دامن پاک نہیں تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت کا خود دشمن ہے۔ خدمت خلق کا ایک اور پہلو بھی ہے' اور وہ ہے لوگوں کی عاقبت سنوارنے کی فکر کرنا' ان تک اللہ کا پیغام پہنچا دینا' تاکہ وہ بھی اللہ کی بندگی کرنے لگیں اور اپنی آخرت کو سنوار سکیں اور یہ خدمت خلق کی بلند ترین سطح ہے۔

آیت ۷۸ میں ذمہ داریوں کی چوتھی سطح کا تذکرہ ہے۔ فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾

''اور اللہ (کی راہ) میں جہاد کرو جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کرنے کا حق ہے۔''

جہاد کا لفظ جدوجہد' کشمکش اور انتہائی سعی و کوشش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ کشمکش اور جدوجہد سرکش قوتوں کے خلاف مطلوب ہے۔ یہ وہ طاقتیں ہیں جو اللہ کی بندگی' اُس کی رضا جوئی اور اُس کی راہ پر چلنے میں مانع ہیں۔ ان قوتوں کو شکست دے کر آدمی خود اپنے آپ کو بھی بندگی کے لیے تیار کرے اور دوسروں کو بھی بندگی کی دعوت دے' یعنی شہادت علی الناس کا فریضہ ادا کرے' اور دنیا میں اللہ کے نظامِ بندگی کے لیے راہ ہموار کرے۔

جہاد کا اوّلین ہدف آدمی کا نفس امارہ ہے۔ لیکن یہ اندرونی معرکہ ہے۔ خارجی سطح پر جہاد فی سبیل اللہ کا پہلا مرحلہ شہادت علی الناس ہے۔ اسی کے لیے اس امت کو چنا گیا ہے۔ چنانچہ آگے فرمایا:

﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾

''اُس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔ (اور تمہارے لیے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا)۔ اُسی نے پہلے (یعنی پہلی

کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے۔ تو جہاد کرو) تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلے میں شاہد ہو۔''

شہادت علی الناس بنیادی طور پر انبیاء و رُسل علیہم السلام کا کام ہے۔ اِس سے پہلے یہ کام وہی کیا کرتے تھے۔ لیکن ختم نبوت کی بنا پر اب یہ کام اِس اُمت کو سونپا گیا ہے۔ چنانچہ دوسروں تک دین کو پہنچانا اور اتمامِ حجت کر دینا اب اِس اُمت کی ذمہ داری ہے۔ اقامت دین بھی شہادت علی الناس کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہ شہادت کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ آپ نظامِ حق بالفعل قائم کر کے دکھائیں گے تو دنیا پر حجت قائم ہو سکے گی۔ اگر آپ یہ نظام قائم نہیں کرتے تو پھر آپ کی بات میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔ فرض کریں' آپ دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے پاس اعلیٰ ترین نظامِ حیات ہے' جو زندگی کے انفرادی اور اجتماعی گوشوں میں بہترین تعلیمات کا مرقع ہے' یہ سیاست' معیشت اور معاشرت میں عدل و انصاف اور اعتدال و توازن کا ضامن ہے' آپ اِسے اپنائیے! تو دنیا کی طرف سے فوراً کہا جائے گا کہ اگر یہ نظام اتنا ہی اچھا ہے تو خود تم نے اپنے ستاون مسلم ممالک یا اُن میں سے چند یا کسی ایک میں یہ نظام قائم کیوں نہیں کر لیا؟ تم کس منہ سے ہمیں اِس کی دعوت دیتے ہو؟ نبی اکرم ﷺ نے دنیا والوں کو یہ نظام بالفعل قائم کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ کے بتلائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے ہمیں بھی یہ کام کرنا ہے اور اِس میں اپنا تن من دھن لگا دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اِس کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آگے فرمایا:

﴿فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾

''پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔''

آیت کے اِس حصے میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کو جو عظیم مشن اور بڑی بڑی ذمہ داریاں دی گئی ہیں' اِن کی ادائیگی کا آغاز کہاں سے ہوگا۔ اِس کام کا آغاز یہاں سے ہوگا کہ پہلے خود اپنے آپ کو شریعت پر کاربند کرو' اللہ کی بندگی کرو' ارکان اسلام بالخصوص اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا اہتمام کرو۔ جیسے کوئی شخص کسی عمارت کی تیسری منزل تک پہنچنا چاہے تو اِسے درجہ بدرجہ اوپر جانا پڑتا ہے' اگر وہ چھلانگ لگا کر تیسری منزل پر پہنچنا چاہے گا تو منہ کے بل گر پڑے گا۔ اسی طرح دین کی سہ منزلہ عمارت میں شہادت علی الناس اور اقامت دین کی بلند منازل تک پہنچنے کے لیے پہلی اور اہم ترین منزل یعنی عبادت ربّ سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔ آپ پہلے اپنے وجود پر دین کو قائم کریں گے تو پھر ہی معاشرے اور ریاست میں غلبۂ دین کے

لیے صحیح معنوں میں جدوجہد کر سکیں گے۔ یہی دینی ذمہ داریوں کی منطقی ترتیب ہے۔

نماز و زکوٰۃ کے حکم کے بعد فرمایا کہ اللہ کے دامن کو مضبوطی سے تھام لو جو تمہارا مولا اور حقیقی مددگار ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۷۸﴾

''اور اللہ (کے دین کی رسّی) کو پکڑے رہو۔ وہی تمہارا دوست ہے اور وہ خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔''

یعنی جس ہستی کا نظام قائم کرنا چاہتے ہو اور اُس کے لیے جہاد کا حق ادا کرنے کا عزم کیا ہے اُس کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ اِس لیے کہ اِس راہ کی کٹھن منزلوں میں وہی تمہاری دستگیری اور مدد فرمائے گا' وہی تمہیں نفس اور شیطان کے حملوں سے محفوظ رکھے گا۔ تمہارا سارا توکل و اعتماد اُسی پر ہونا چاہیے' نہ کہ اپنی صلاحیتوں' محنت اور وسائل پر۔ وہ چاہے گا تو حق کی دعوت آگے بڑھے گی' راہِ حق کی رکاوٹیں دور ہوں گی' مشکلیں آسان ہوگی۔ وہ نہ چاہے گا تو خوراک کا نوالہ بھی زہر بن جائے گا جو تم منہ میں لے جاتے ہو۔

یہ اعتصام باللہ اور تعلق مع اللہ سب سے اہم شے ہے' جسے بعض اوقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا' شیطان کا وار اُسی قدر بے اثر ہوگا اور اُس کے حملے سے اتنی ہی حفاظت ہو سکے گی۔ شیطان ہر لمحے انسان کو راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے کسی بھی شخص کو شیطان کی چالوں اور ہتھکنڈوں سے خود کو محفوظ و مامون نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ سوچ اِس بات کی علامت ہے کہ وہ پہلے ہی شیطان کا شکار ہو چکا ہے۔ شیطان تو لوگوں کے گھات میں بیٹھا ہے' جیسے ہی اِسے موقع ملتا ہے حملہ کر دیتا ہے۔ اُس کے حملوں سے بچاؤ اللہ سے جڑنے میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے:

﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۶﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

''اور اگر تمہیں شیطان کی جانب سے کوئی چوک لگے (وسوسہ پیدا ہو) تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ بے شک وہ خوب سنتا اور جانتا ہے۔''

اعتصام باللہ کے لیے کچھ چیزیں تو وہ ہیں جو ہمیں اِسی آیت میں بتا دی گئی ہیں' یعنی ہم نماز روزہ کی پابندی کریں' صاحب نصاب ہیں تو زکوٰۃ ادا کریں ـــــ اِس کے علاوہ

چند چیزیں اور بھی ہیں جو تعلق مع اللہ کو بڑھانے والی ہیں۔ ہمیں اِن کا بھی خصوصی طور پر اہتمام کرنا چاہیے:

(۱) تلاوتِ قرآن کریم:

کلام الٰہی کی تلاوت اللہ سے تعلق کو مضبوط بناتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ تلاوت قرآن حکیم کا اہتمام کریں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم تنظیم میں شامل ہو گئے ہوں اور تنظیمی پروگراموں میں شریک ہو رہے ہوں' دروس قرآن کی محافل بھی attend کر رہے ہوں' مگر کئی کئی ہفتوں تک قرآن کی تلاوت ہی نہیں ہو رہی ہو' قرآن کو کھول کر پڑھنے اور سمجھنے کا وقت ہی نہیں نکال رہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ شدید خطرے کی علامت ہے۔ ہمیں اِس صورت حال کی اصلاح کرنی چاہیے' اور آج ہی سے صبح و شام تلاوت کو معمول بنا لینا چاہیے۔

(۲) قیام اللیل:

راتوں کو اللہ کے حضور کھڑے ہونا تعلق مع اللہ کا بہت اہم ذریعہ ہے۔ قیام اللیل میں نماز بھی ہے اور قرآن کا پڑھنا بھی ہے۔ قیام اللیل کی خصوصی اہمیت ہے۔ اِسی سے اہل ایمان کو وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو باطل کے خلاف کشمکش میں درکار ہوتی ہے۔ یہاں ایک خاص بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ جب قیام اللیل کی بات آتی ہے تو بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ خانقاہیت پھیلائی جا رہی ہے' حالانکہ ہمیں انقلابیت کی ضرورت ہے۔ یہ اندازِ فکر درست نہیں ہے۔ اِس کی اصلاح کی جانی چاہیے۔ ذرا سوچئے' ہم کون سی انقلابیت کی بات کر رہے ہیں؟ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب سے بڑے انقلابی نہیں تھے؟ اُن کی انقلابیت کا نقشہ کیا تھا؟ اُن کے متعلق خود دشمنوں نے کیا الفاظ کہے تھے: **هم رهبان باللّيل و فرسان بالنهار**۔ یعنی وہ رات کے راہب اور دن کے شہسوار نظر آتے ہیں۔ اُن کا حال تو یہ تھا کہ وہ محاذ جنگ پر بھی راتوں کو اللہ کے حضور کھڑے رہتے تھے۔ غور کیجئے' اگلے دن ایرانی فوج کے خلاف جہاد ہونا تھا' یہ موقع وہ تھا کہ صحابہؓ کو رات میں زیادہ آرام کی ضرورت تھی' مگر وہ رات کو اللہ کے حضور کھڑے تھے' کیونکہ اُن کا یہ پختہ ایمان تھا کہ اصل طاقت اور قوت اللہ سے لو لگانے سے حاصل ہوگی۔ ہمارے دین نے جو انقلابیت سکھائی ہے' وہ اسی قسم کی رہبانیت (مراد ترکِ دنیا نہیں' بلکہ اللہ سے تعلق کی استواری ہے) سے ہو کر گزرتی ہے۔ صحیح انقلابی وہ لوگ ہیں جن کا حال یہ ہو کہ ان کی راتیں قیام میں گزرتی ہوں' اُن کی سجدہ گاہیں خوف اور ندامت کے

آنسوؤں سے تر ہوں۔ وہ دن کے وقت تو مجاہد اور شہسوار ہوں اور نظام باطل کو اکھاڑنے کے لیے اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں خرچ کرتے ہوں' مگر ان کی راتیں اللہ سے مناجات میں بسر ہوتی ہوں۔

(۳) ذکر اذکار:

اللہ سے تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری زبانیں اللہ کے ذکر سے تر ہوں۔ ہم کثرت سے اللہ کو یاد کریں۔ صبح و شام ذکر کا اہتمام کریں۔ خود قرآن نے جا بجا ذکر کی تعلیم دی ہے۔ سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾

''اور اپنے پروردگار کو دل ہی دل میں عاجزی اور خوف سے اور پست آواز سے صبح و شام یاد کرتے رہو' اور (دیکھنا) غافل نہ ہو جانا۔''

اسی طرح ہمیں ادعیۂ ماثورہ کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔

(۴) کثرتِ استغفار:

ہمیں چاہیے کہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں' کثرت سے استغفار کریں۔ رسول خدا ﷺ تو معصوم عن الخطا تھے' مگر اِس کے باوجود استغفار آپ کا معمول تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو مقامِ بلند عطا فرمایا' یہ اُس پر شکر کی بجا آوری کا ایک ذریعہ تھا۔ ہم تو گناہ گار ہیں۔ دن رات میں ہم سے کئی گناہ اور خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔ اِن پر اللہ سے زیادہ سے زیادہ معافی مانگنا ضروری ہے۔ استغفار جہاں ہمارے گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے' وہاں اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ اِس سے باطنی بیماریوں کا علاج ہوگا۔ ہم جتنا استغفار کریں گے ہمارے اندر اتنی ہی تواضع پیدا ہوگی اور اُسی قدر ہم عُجب اور تکبر سے بچ سکیں گے۔ ورنہ اگر ہم اپنی کسی نیکی کے سبب اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگے اور دوسروں کو حقیر گردانا تو یہ شے سخت مہلک ثابت ہو گی اور ہمارا کیا کرایا صفر ہو جائے گا۔

(۵) درود شریف:

ہمیں کثرت سے درود شریف پڑھنا چاہیے۔ یہ دراصل انسانیت کے سب سے بڑے

محسن نبی آخرالزمان ﷺ کے حق میں دعا ہے جو ہم کرتے ہیں۔ یہ اُس رفیع الشان اور عظیم المرتبت ہستی کے حضور عقیدت کا نذرانہ ہے جس کے ذریعے ہمیں اسلام کی دولت ملی۔ ہمیں اِس کا ذوق وشوق سے اہتمام کرنا چاہیے ـــــ یہاں یہ بات بھی واضح ہو کہ ذکر اذکار‘ ادعیۂ ماثورہ‘ استغفار اور درود وہ چیزیں ہیں جن کے لیے کوئی اضافی وقت نکالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ سفر وحضر میں‘ اٹھتے بیٹھتے یہ کام کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اِن چیزوں کو اپنی زندگی کے معمولات میں شامل کر لیجیے۔

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ (سورۃ الحج کی آخری آیت میں) اللہ تعالیٰ نے ہم پر شہادت علی الناس کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ اور شہادت علی الناس کے تذکرے کے بعد ہم میں سے ہر شخص کو انفرادی سطح پر دو اہداف دیے ہیں‘ جو غلبۂ دین حق کی جدوجہد میں ہمیں اصل طاقت فراہم کرتے ہیں۔ اُن میں سے ایک ارکانِ اسلام کی پابندی اور دوسرا اعتصام باللہ‘ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط تعلق استوار کرنا ہے۔

☆☆☆

اب آیئے‘ اجتماعی جدوجہد کی طرف!

تنظیمی سطح پر ہم جو جدوجہد کر رہے ہیں‘ اِس کے حوالے سے چند باتیں ایسی ہیں جو اِس جدوجہد میں ’’bottom line‘‘ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِن باتوں سے ہم نے اپنی جدوجہد کا آغاز کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم نے جو عہد بندگی کیا ہے‘ اِس کے تقاضوں کو پورے کرنے کے لیے اگر ہم راہِ حق میں اپنا سب کچھ بھی نچھاور کر دیں تو بھی معاملہ یہ ہوگا کہ ع ’’حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا‘‘۔ تاہم ان بنیادی باتوں سے اندازہ ہوگا کہ تنظیم میں‘ جو عہد بندگی کو پورا کرنے میں ہماری معاون ہے‘ ہماری شمولیت بامعنی ہے یا نہیں! وہ باتیں یہ ہیں:

(۱) نظم جماعت کی پابندی

پہلی بات یہ ہے کہ ہم جماعت کے نظم کی پوری پابندی کریں۔ یہ بیعت سمع وطاعت کا تقاضا ہے۔ تنظیم کے پروگراموں کو اپنے تمام کاموں پر ترجیح دیں۔ اپنے اوقات کی قربانی دے کر تنظیمی اجتماعات اور پروگراموں میں شرکت کریں۔ یہ ہمارا ٹیسٹ کیس ہے۔ اِس سے معلوم ہوگا کہ آیا ہم دنیا کو ترجیح دیتے ہیں یا آخرت کی کامیابی ہمارا مطمحِ نظر ہے۔ اگر پیشِ نظر دنیا ہے تو اِن پروگراموں میں شرکت بوجھ محسوس ہوگی‘ آپ کی توجہ کا اصل ہدف دنیا کے معاملات و

مسائل ہوں گے‘ تنظیمی پروگراموں میں عدم شرکت کے لیے ہر ہر موڑ پر عذر تراشیں گے۔ (یہ الگ بات ہے کہ اگر کوئی واقعی اور حقیقی ضرورتِ داعی ہو تو عذر کیا جا سکتا ہے۔) اگر آپ کا ہدف آخرت کی فلاح ہے تو پھر دنیا کے معاملات و مسائل آپ کی تنظیمی ذمہ داریوں کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے۔ آپ اپنے اوقات اور نجی مصروفیات کو اِس طور سے ترتیب دیں گے کہ تنظیمی پروگراموں میں آپ کی شرکت متاثر نہیں ہوگی۔

(۲) دعوتی کام

آپ تنظیم میں اس لیے شامل ہوئے ہیں تاکہ اس عظیم مشن کو آگے بڑھا سکیں جو اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ناطے ہمیں سونپا گیا ہے‘ یعنی شہادت علی الناس اور غلبہ و اقامت دین! اقامت دین کی اِس جدوجہد میں پہلا مرحلہ دعوت ہے۔ اِس لیے آپ میں سے ہر شخص دعوت کا کام کرے۔ اِسی سے تنظیم میں آپ کی عملی شمولیت ہو سکے گی۔ اگر آپ دعوت کا کام نہیں کر رہے‘ اِس کام میں آپ کا کوئی حصہ نہیں ہے‘ تو پھر تنظیم میں آپ کی شمولیت کا کوئی مطلب نہیں۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ فرائض دینی کی ادائیگی ہماری اپنی ضرورت ہے‘ یہ جماعت کا مسئلہ نہیں‘ جماعت دراصل اِس معاملے میں ہماری معاون ہے۔ بہرحال ہر رفیق کو چاہیے کہ دعوت کے کام میں حصہ ڈالے۔ ملتزم ہی نہیں‘ ہر مبتدی رفیق بھی کم از کم ایک شخص کو ضرور دعوت کا ہدف بنالے۔ تحریک دعوت اور نظام دعوت کے ذریعے یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ داعی کے لیے مدرس یا مقرر ہونا ضروری نہیں‘ بلکہ ایسا شخص بھی داعی ہو سکتا ہے جو مجمع کے سامنے دو لفظ بھی نہیں بول سکتا۔ اس لیے کہ وہ لوگوں کو دعوتی پروگراموں کے لیے دعوت دے سکتا ہے‘ انہیں حلقہ قرآنی میں بلا سکتا ہے۔ گویا ہر شخص داعی بن سکتا ہے‘ خواہ وہ مقرر نہ بھی ہو۔ اور اگر وہ مقرر اور مدرس بھی ہو تو یہ نورٌ علیٰ نور والی بات ہے۔

(۳) تنظیمی جرائد کا مطالعہ

تیسری بات جو تنظیم سے وابستگی کے حوالے سے ضروری ہے‘ وہ یہ کہ تنظیم کے جرائد ’’میثاق‘‘ اور ’’ندائے خلافت‘‘ کا باقاعدگی سے مطالعہ کیجئے۔ ان جرائد کو عام کیجئے‘ ان کو اپنی دعوت کا ذریعہ بنائیے‘ اپنے حلقہ احباب میں پہنچائیے۔ اِس سے جہاں دعوت کو فروغ حاصل ہوگا‘ وہاں یہ چیز آپ کی تنظیم سے وابستگی اور تعلق کی مضبوطی کا ذریعہ بنے گی۔

میں آخر میں آپ سب شرکاء کا شکریہ ادا کرتا کہ آپ اپنے مال اور اوقات کی قربانی دے کر اجتماع میں شریک ہوئے۔ تمام مقررین و مدرسین کا بھی شکریہ کہ انہوں نے بہت محنت اور بھرپور تیاری کر کے اپنے دروس اور خطابات کے ذریعے شرکاء اجتماع کی فکری و عملی رہنمائی کی۔ اجتماع کے منتظمین بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں' جنہوں نے دن رات ایک کر کے اجتماع کے عمدہ انتظامات کیے۔ اللہ تعالیٰ اِس کام میں شریک ہونے والے سب لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ میری آپ سے بھی گزارش ہے کہ میرے لیے خصوصی طور پر دعا کریں کہ تنظیم کی امارت کا جو بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر آن پڑا ہے اُس کے تقاضوں کو پورا کر سکوں۔

اقولُ قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

اسلام کے نظامِ تعلیم وتربیت میں اجتماعِ جمعہ کی اہمیت

اور خطبۂ جمعہ کی اہمیت واصل غرض وغایت

سے آگاہی کے لیے مطالعہ کیجیے:

خطبہ جمعہ

عربی متن کا ترجمہ وتشریح

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید

کے چند خطابات جمعہ کی تلخیص

عمدہ طباعت ❁ سفید کاغذ ❁ قیمت: 30 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

کائنات کی تخلیق اور آسمانی ہدایت کے تدریجی مراحل

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۷/نومبر ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

بمقام قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور

تنظیم اسلامی کا کُل پاکستان اجتماعِ عام ۲ تا ۴ نومبر ۲۰۰۸ء فردوسی فارم، دراجکے (سادھوکی) کے مقام پر منعقد ہوا۔ اجتماع کے آخری روز ۴ نومبر کو شرکاءِ اجتماع ریلی کی صورت میں اجتماع گاہ سے روانہ ہوئے اور جی ٹی روڈ کے راستے مینارِ پاکستان پہنچے۔ مینارِ پاکستان کے سبزہ زار میں بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ تعالیٰ نے رفقاءِ تنظیم اسلامی اور دیگر حاضرین سے سورۃ المدثر کی آیات ۳۲۔۳۶ اور سورۃ الانشقاق کی آیات ۱۶۔۲۰ کی روشنی میں ایک مختصر مگر جامع خطاب فرمایا۔ بعدازاں محترم ڈاکٹر صاحب نے اس جامع اور compact خطاب کے مضامین کو جامع القرآن قرآن اکیڈمی لاہور میں اپنے خطاباتِ جمعہ میں سلسلہ وار بیان فرمانا شروع کیا۔ اس سلسلے کا پہلا خطاب ۷/نومبر کو ہوا، جسے مرتب کر کے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ادارۂ میثاق)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿کَلَّا وَالۡقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّیۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّہَا لَاِحۡدَی

الۡکُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِیۡرًا لِّلۡبَشَرِ ﴿۳۶﴾﴾ (المدثر)

﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ لَتَرۡکَبُنَّ

طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ فَمَا لَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ (الانشقاق)

اللہ تعالیٰ کے احسانات پر شکر کی تلقین

محترم رفقاءِ تنظیم اسلامی واحبابِ گرامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو کچھ نعمتیں بخشی ہیں اُن پر میں خود بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ سب سے بھی یہ کہتا ہوں کہ اللہ کا شکر ادا کریں۔ ویسے تو قرآن میں آیا ہے کہ: ﴿وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡھَا ؕ﴾ (ابراھیم:۳۴) ''اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو اُن کا احاطہ نہیں کر سکتے''۔ یقیناً اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں، جن کا ہمیں احساس اور ادراک نہیں، لیکن بہرحال جو بڑی بڑی نعمتیں ہمیں عطا ہوئی ہیں انہیں گن لیجیے۔

سب سے پہلے ہمیں اس پر شکر کرنا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں شرفِ انسانیت سے سرفراز فرمایا۔ وہ انسان جو مسجودِ ملائک ہے، جس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ﴾ (الاسراء: ۷۰) ''اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو تکریم عطا کی ہے اس کے باعث یہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو بنی نوعِ آدم میں سے پیدا کیا یہ اللہ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔

پھر اس کا دوسرا بڑا احسان ہم پر یہ ہے کہ ہمیں مسلمانوں کے گھروں میں پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہماری کسی محنت کو دخل نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اگر خدانخواستہ ہم کسی غیر مسلم گھرانے میں، ہندوؤں میں، سکھوں میں، عیسائیوں میں یا

یہودیوں میں پیدا ہو گئے ہوتے تو اِس بات کا کتنا امکان تھا کہ ہمیں نعمتِ اسلام میسر آتی؟ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو پھر بھی اپنی طلب وجستجو سے تلاشِ حق میں سرگرداں ہوتے اور اسلام کو اختیار کرتے؟ ظاہر بات ہے کہ اس کا تو نہ ہونے کے برابر امکان ہے۔ تو یہ اللہ کا دوسرا بڑا فضل واحسان ہے کہ اس نے ہمیں مسلمانوں میں پیدا کیا۔

تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دولت ایمان سے نوازا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک خصوصی عنایت ہے اور یہ وہ دولت ہے جس سے تمام مسلمان سرفراز نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور قلب کی گہرائیوں میں دیکھیں تو ہم میں سے جس کو بھی وہاں ایمان نظر آئے وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ اس لیے کہ ایمان سے بڑی دولت اور کوئی نہیں۔

پھر اس پر بھی اللہ کا شکر واجب ہے کہ اُس نے ہمارے سینوں کو اسلام کے لیے کھول دیا۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ ہم جو یہ دعا مانگا کرتے ہیں: **اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ قُلُوْبَنَا بِالْاِیْمَانِ وَاشْرَحْ صُدُوْرَنَا لِلْاِسْلَامِ** ''اے اللہ! ہمارے دلوں کو نورِ ایمان سے منور فرما دے اور ہمارے سینوں کو اسلام کے لیے کھول دے''۔ تو ایک ہے ایمان سے دلوں کا منور ہو جانا اور ایک ہے اسلام پر انشراح حاصل ہو جانا۔ یعنی یہ اطمینان حاصل ہو جانا کہ یہی بہترین نظام ہے جو اللہ نے ہمیں عطا کیا۔ اس کی تفاصیل پر بھی ذہناً اور عقلاً اطمینان ہو جانا کہ واقعتاً یہی بہترین نظام اور یہی بہترین قانون ہے جو اللہ نے عطا فرمایا ہے۔ اس پر انشراح ہو جانا کہ یہی سیاسی نظام' یہی معاشی نظام اور یہی سماجی نظام بہترین ہے جو اللہ نے دیا ہے۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان گنوایا ہے: ﴿**اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ**﴾ (الانشراح) ''کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا؟'' ایک اور مقام پر آتا ہے: ﴿**فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ**﴾ (الانعام: ۱۲۵) ''پس جس کے لیے اللہ ارادہ کرتا ہے کہ اسے ہدایت بخشے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے''۔ یعنی اس کو واقعتاً نظر آ جاتا ہے کہ اسلام کی ہر تعلیم بہترین ہے' نورانی ہے' عقل وشعور کے ترازو میں پوری اترنے والی ہے۔ اس پر

جس کسی کو بھی انشراح حاصل ہو جائے، جس درجے میں بھی ہو اس پر اللہ کا بڑا فضل ہے، اور اس کے ذمے ہے کہ وہ اللہ کے اس احسان پر شکر ادا کرے۔

پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا ہم پر یہ فضل ہوا ہے کہ اُس نے ہمیں دین کا جامع تصور بھی بخشا اور فرائض دینی کے جامع تصور کا شعور بھی عطا کیا۔ دین کا جامع تصور یہ کہ دین اسلام صرف ایک مذہب نہیں ہے، یہ صرف انفرادی زندگی کا معاملہ نہیں ہے، یہ صرف عقائد، عبادات اور چند رسومات پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ یہ دین ہے، ایک مکمل نظام ہے۔ اور ایک مکمل نظام ہونے کی وجہ سے ہی سے یہ نوعِ انسانی کے لیے رحمت بنتا ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ واحد نظام ہے جو سیاسی سطح پر، معاشی سطح پر اور سماجی سطح پر عدل و انصاف فراہم کرتا ہے۔ اس سوشل جسٹس کے لیے قرآن ''قسط'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے اور اہل ایمان کو حکم دیتا ہے کہ اس قسط کو قائم کرو: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵) ''اے ایمان والو! عدل وانصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ اور اللہ کی طرف سے گواہی دینے والے بن جاؤ''۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ﴾ (الاعراف:۲۹) ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میرے ربّ نے تو مجھے عدل کا حکم دیا ہے''۔ اور سورۃ الحدید میں یہ بھی فرمایا کہ: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (آیت ۲۵) ''ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا بینات (اپنی نشانیاں اور واضح تعلیمات) دے کر اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری، تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں''۔ تو وہ دین جو ہمیں ملا ہے درحقیقت ایک مکمل اور اس کے ساتھ ساتھ معتدل اور متوازن سسٹم آف سوشل جسٹس ہے، محض عقیدہ، عبادات اور رسومات کا پلندہ نہیں۔

پھر یہ کہ ہمیں فرائض دینی کا جامع تصور نصیب ہوا کہ جہاں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج فرض ہے وہاں اقامت دین کی جدوجہد بھی فرض ہے۔ مسلمانوں میں سے بہت کم لوگ ہیں جو اِس تصور کے حامل ہیں۔ آج ۹۹ فیصد مسلمان تو اسلام کو صرف مذہب سمجھ رہے

ہیں‘ دین سمجھ ہی نہیں رہے۔ اور اس کو قائم کرنا بھی کوئی ذمہ داری ہے‘ اس کا تو ہمارے ہاں کوئی تصور ہے ہی نہیں۔ عبادات کا تصور تو بہت پختہ ہے۔ ہر سال تیس تیس لاکھ آدمی حج کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں عمروں کی ادائیگی کا بھی بہت ذوق وشوق ہے اور رمضانِ مبارک کے عمرے میں حج سے بھی زیادہ حاضری ہو جاتی ہے۔ حیران کن بات ہے کہ اب ہزاروں افراد کے اعتکاف ہونے لگے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے اس شہر لاہور میں ۲۵ ہزار افراد کا شہر اعتکاف آباد کیا گیا۔ شنید ہے کہ اہل حدیث حضرات کے ہاں جامع قادسیہ میں بھی اڑھائی ہزار کے قریب لوگ اعتکاف میں بیٹھے۔ تو یہ مذہب کا تصور تو ہے‘ مگر دین کہاں ہے؟ روئے ارضی پر کوئی ایک انچ زمین دکھا دیں جہاں اللہ کا دین بہ تمام وکمال قائم ہو! چنانچہ اقامت دین کی فرضیت کا شعور بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ پھر اس کے لیے کسی منظّم جماعت میں شامل ہو کر دامے‘ درمے‘ سخنے‘ اپنی جان اور مال کے ذریعے سے جدوجہد کی جائے‘ یہ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے جو کسی فردِ بشر پر ہو سکتا ہے۔ تو اِن تمام انعامات پر اللہ تعالیٰ کا شکر و سپاس لازم ہے۔

میں نے ابھی اللہ تعالیٰ کے مادّی انعامات کا ذکر نہیں کیا جو ہمیں میسر ہیں۔ بے شمار ایسی بیش قیمت نعمتیں ہیں جو بلا قیمت ملتی ہیں۔ مثلاً ہوا اور پانی ہی کو لیجیے جن پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔ اور نمعلوم کتنی نعمتیں ہیں جن کا ہم حساب بھی نہیں کر سکتے۔ ہمیں آج معلوم ہوا ہے کہ ہری مرچ کے اندر وٹامن سی کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ امیر آدمی وٹامن سی حاصل کرنے کے لیے سنگترے اور مالٹے کھاتا ہے‘ لیکن اللہ نے ایسا نظام رکھا ہے کہ غریب آدمی بھی محروم نہ رہے۔ چنانچہ ہری مرچ کے اندر اس سے کئی گنا زیادہ وٹامن سی رکھ دیا ہے۔ اگر کسی غریب آدمی نے ہری مرچ میں نمک رگڑ کر اس کی چٹنی بنائی اور اس سے روٹی کھالی تو اس کو بھی وٹامن سی تو مل گیا۔ اسی طرح وٹامن اے کا ڈلیور آئل اور دوسرے بڑے قیمتی روغنیات میں ہوتا ہے‘ لیکن اس کی سب سے بڑی مقدار گاجر میں ہے۔ یہ تو جیسے جیسے ہماری سائنسی معلومات بڑھ رہی ہیں تو اللہ کی نعمتوں کا اندازہ ہو رہا

ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں تو کھلی ہیں لیکن دل اندھے ہیں۔ یہ چیزیں نظر آ رہی ہیں' لیکن اللہ کی نعمت کا تصور اب بھی حاصل نہیں ہو رہا۔

دو قرآنی دعاؤں کے التزام کی ہدایت

آپ پر اللہ تعالیٰ کے جو انعامات اور احسانات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے دو دعاؤں کا التزام کریں اور انہیں اپنا صبح و شام کا وظیفہ بنالیں ـــــ ایک تو وہ دُعا جو سورۃ الاعراف میں نقل کی گئی ہے۔ جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تب ایک ترانۂ حمد اُن کے دلوں کی گہرائیوں سے نکلے گا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ (آیت ۴۳) ''کل شکر و سپاس' کل حمد و ثنا اور کل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اِس مقام تک پہنچا دیا' اور ہم کبھی یہاں نہ پہنچ پاتے اگر اللہ ہماری راہنمائی نہ کرتا''۔ هَدٰىنَا لِهٰذَا کا ترجمہ تو ہوگا ''جس نے ہمیں اس کی ہدایت دی''۔ یعنی ہمیں ہدایت دی جس کے نتیجے میں ہم یہاں تک پہنچ گئے۔ اور ہدایت کا آخری درجہ یہی ہوتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ واضح کیا ہے کہ آپ سے کوئی شخص کسی جگہ کا پتا پوچھتا ہے۔ آپ اُس کی راہنمائی کرتے ہیں کہ یہاں سے سیدھے چلے جاؤ' آگے چوک سے بائیں ہو جانا' پھر چوتھی لائٹ آئے گی تو اس سے دائیں مڑ جانا..... یہ بھی ہدایت (راہنمائی) ہے۔ آپ نے اسے راستہ تو بتا دیا نا! لیکن اگر آپ اس کی انگلی پکڑ کر کہیں کہ آؤ بھئی میں آپ کو وہاں پہنچا دیتا ہوں اور اسے اپنے ساتھ لے کر اُس کی منزل تک پہنچا آئیں تو یہ راہنمائی کا بہترین انداز ہے۔

اللہ کی ہدایت کی بھی آخری شکل یہ ہے کہ وہ انگلی پکڑ کر ہمیں ہدایت کی آخری منزل تک پہنچا دے۔ یقیناً وہ اس طرح کی ہدایت سے بھی نوازتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ یہ اُس کی سنت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ﴾ (العنکبوت:۶۹) ''اور جو لوگ ہماری راہ میں محنت کرتے ہیں ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھائیں گے۔'' اور یہ محنت اللہ کی معرفت حاصل کرنے کی محنت بھی ہے ـــــ

اللہ پر ایمان حاصل کرنے کی محنت بھی ہے ـــــ پھر صحیح طرز پر کام کرنے والی جماعت کی شناخت اور پہچان کی محنت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ایسی محنت کرنے والوں کے لیے اپنے راستے کھول دیتا ہے۔ تو یہ ساری نعمتیں جو میں نے گنوائی ہیں ان پر اہل جنت کا ترانہ ہماری زبانوں پر جاری ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں رہتے ہوئے گویا جنت کی نعمت عطا کر دی ہے۔ یہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ جب انہیں حکومت وقت کی طرف سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور تشدد و تعذیب کا نشانہ بنایا گیا تو وہ کہا کرتے تھے کہ تم میرے جسم کو تکلیف دے سکتے ہو' لیکن میری جنت تو میرے ساتھ ہے (اِنَّ جَنَّتِیْ مَعِیَ)۔ میری جنت میرے دل میں موجود ہے' اسے تو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ یعنی جسم کو تو مار پڑ سکتی ہے' روح کو تو نہیں پڑ سکتی۔ وہ ایمان جو میرے اندر ہے' جس نے میرے قلب کو منور کیا ہے اور وہ انشراح جو مجھے اسلام پر ہے اس کو تو کوئی چوٹ نہیں لگتی۔ چنانچہ ہمیں بھی اہل جنت کا یہ ترانۂ حمد اپنا صبح و شام کا وظیفہ بنا لینا چاہیے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾

''کل شکر اور کل حمد و ثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اس راستے کی ہدایت دی اور یہاں تک پہنچایا' اور ہم ہرگز ہدایت یافتہ نہ ہو سکتے اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا''۔

یہ بات قرآن مجید میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے کہ اگر اللہ نہ چاہے تو انسان نہ تو ہدایت یافتہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی تذکر اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے: ﴿وَمَا یَذْكُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ (المدثر:٥٦) ''اور یہ کوئی نصیحت حاصل نہیں کریں گے الّا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔''

پھر اس کے بعد دوسری دعا یہ کی جائے:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸﴾ (آل عمران)

''پروردگار! جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اب ہمارے دلوں کو کج نہ ہونے

دے (ایسا نہ ہو کہ ہم وساوسِ شیطانی کا شکار ہو جائیں یا شیطان کا کوئی اور وار ہم پر کارگر ہو جائے۔ کہیں دنیا کی محبت تیری راہ میں جدوجہد کرنے کی محبت سے زیادہ نہ ہو جائے۔) اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ یقیناً تو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔''

یہ تُو ہی ہے جو ہمیں ہدایت پر قائم رکھ سکتا ہے۔ ہم سب کے دل تیری دو انگلیوں کے مابین ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے: ((یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ)) اے دلوں کو پھیر دینے والے! میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھنا''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ قُلُوْبَ الْعِبَادِ بَیْنَ اُصْبُعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ یُقَلِّبُهَا کَیْفَ یَشَاءُ)) (رواہ الترمذی واحمد) ''تمام انسانوں کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے مابین ہیں' وہ انہیں جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے''۔ **اَللّٰهُمَّ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلَی الْاِیْمَانِ' اَللّٰهُمَّ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلَی الْجِهَادِ.** ''اے اللہ! ہمارے دلوں کو ایمان اور جہاد کی طرف پھیر دے!''

اس ضمن میں مجھے ۱۹۵۱ء کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے سالانہ اجتماع کے موقع پر کراچی سے ایک دوست آئے تھے' جن سے اوّلین تعارف تو جمعیت کے رکن کی حیثیت سے تھا' لیکن مزید تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ ہمارے رشتہ دار بھی ہیں۔ ان کے پاس ایک آٹوگراف بک تھی اور انہوں نے مجھ سے آٹوگراف لینے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اُس وقت یہی دو آیتیں لکھی تھیں۔ مجھے اپنی تحریر کے الفاظ ابھی تک یاد ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے اس کی بہت قدر کی تھی اور اسے بہت عام کیا تھا۔ میں نے لکھا تھا:

''میرا دل کبھی کبھی ان لوگوں کے تصور سے کانپ اٹھتا ہے جو کبھی اقامت دین کے قافلے میں شریک تھے' اور نمایاں طور پر شریک تھے' اور اس کے بعد پھر اس قافلے کو چھوڑ کر دنیا میں گم ہو گئے۔ میں خود ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ﴾ کے بعد اس دعا کا سہارا لیا کرتا ہوں کہ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ

اَنۡتَ الۡوَهَّابُ﴿۸﴾ .....''

یہ دوست خرم جاہ مراد (مرحوم) تھے' جو بعد میں بہت مشہور ہوئے۔ جماعت اسلامی کے نائب امیر بھی رہے اور ان کی کافی تالیفات بھی ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ میں ہم ساتھی تھے۔ مجھ سے پہلے وہ جمعیت کے آل پاکستان ناظم اعلیٰ تھے۔ بہرحال یہ تو میری گفتگو کا پہلا حصہ تھا۔ اب اس کے بعد اصل مضمون کی طرف آتے ہیں۔

تخلیق کائنات کے تدریجی مراحل

یہ بات ایمان و یقین کا جزوِ لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا بلاشرکت غیرے مالک بھی ہے اور خالق بھی۔ جس طرح حروفِ تہجی میں پہلا حرف ''الف'' ہے اسی طرح یہ بات بھی ہمارے ایمان کی ''الف'' کا درجہ رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے خالق و مالک ہے۔ نہ اُس کی تخلیق میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ ہی اُس کے مالک ہونے میں کوئی شریک ہے۔ وہ حاکم اعلیٰ بھی ہے اور آمر مطلق بھی۔ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ''آمر'' مَیں پہلی مرتبہ استعمال کر رہا ہوں۔ آمر اور آمریت جیسے الفاظ ہماری سیاسی لغت میں گالی بن چکے ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس طرح تکبر ہم انسانوں کے اعتبار سے ایک بہت بری چیز ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات پر تو یہ جامہ بالکل راست آتا ہے' چنانچہ اُس کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک ''المُتکبّر'' بھی ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ سب سے بڑا آمر ہے! ازروئے الفاظِ قرآنی : ﴿اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ؕ﴾ (الاعراف:۵۴) ''جان لو کہ تخلیق بھی اُسی کی ہے اور امر بھی اُسی کا ہے''۔ یہ دونوں عالم' عالمِ خلق اور عالمِ امر اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہیں۔ عالمِ امر میں بھی کوئی شے وقوع پذیر نہیں ہوسکتی جب تک کہ اللہ کا اِذن نہ ہو اور عالمِ خلق میں بھی کسی شے کا ظہور نہیں ہوسکتا جب تک کہ اللہ کا اِذن نہ ہو۔ دوسری بات یہ واضح رہنی چاہیے کہ اُس کے امر کی شان ''کُنۡ فَیَکُوۡنُ'' ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ ہیں: ﴿اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ﴿۸۲﴾﴾ (یٰسٓ) ''اُس کے امر کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اُس سے کہتا ہے ہو جا' پس وہ ہو جاتی ہے۔'' اس عالمِ امر میں

وقت کا عنصر (time element) بالکل نہیں ہے۔ چشم زدن میں بھی وقت لگتا ہے' جبکہ عالمِ امر میں اتنا وقت بھی نہیں لگتا۔ اس عالمِ امر سے متعلق دو مخلوقات ہیں: ملائکہ اور انسانی ارواح۔ انسانوں کا جسم یعنی حیوانی وجود تو عالمِ خلق کی شے ہے' لیکن روح عالمِ امر کی شے ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں سوال کیا گیا تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ ''(اے نبی) یہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھ رہے ہیں''۔ ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ (آیت ۸۵) ''آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے ربّ کے امر میں سے ہے''۔ اس کا تعلق عالمِ خلق سے نہیں ہے' اس مادّی عالَم سے نہیں ہے' یہ شے بالکل دوسری ہے۔ تو عالمِ امر میں اللہ تعالیٰ کے احکام پورا ہونے میں چشمِ زدن کا وقت بھی نہیں لیتے۔

البتہ عالمِ خلق کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں وقت لگتا ہے اور تدریجاً کوئی شے وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے نوٹ کیجیے کہ کائنات کی تخلیق کے بارے میں جو نظریہ سب سے زیادہ مقبول ہے وہ ''Big Bang'' کہلاتا ہے' جس کی توثیق (verification) کے لیے زیرِ زمین ۲۷ کلومیٹر لمبی سرنگ کھودی گئی ہے۔ سائنسی اصول یہ ہے کہ نظریہ اُس وقت تک نظریہ (Hypothesis) رہتا ہے جب تک کہ ثابت (verify) نہ ہو جائے۔ ڈارون کا نظریہ آج تک ثابت نہیں ہو سکا' لہٰذا ایک نظریے کی حیثیت سے تو لوگ اسے مانتے ہیں' لیکن اس کی شدید مخالفت بھی ہے۔ اس کے برعکس یہ بات کہ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنا ہے' ایک ثابت شدہ سائنسی حقیقت ہے۔ پانی کا hydrolysis کر لیجیے' آکسیجن اور ہائیڈروجن علیحدہ علیحدہ وجود میں آ جائیں گے' جبکہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے اندر الیکٹرک سپارک کیجیے تو پانی بن جائے گا۔

بہرحال Big Bang ایک نظریہ ہے' اگرچہ اس پر محققین کا تقریباً اجماع ہو چکا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے اِس مادّی کائنات کی تخلیق کا آغاز اربوں سال پہلے ایک بہت بڑے دھماکے سے ہوا تھا' جس سے ایٹم سے بھی نہایت چھوٹے ذرات fotons وجود

میں آئے‘ جن کا درجہ حرارت ناقابل تصور حد تک بلند (کھربوں ڈگری سینٹی گریڈ) تھا اور جو ناقابل تصور تیز رفتاری کے ساتھ ایک دوسرے سے دور بھاگ رہے تھے‘ جس کے نتیجے میں یہ آتشیں گولہ حجم میں تیزی سے بڑھتا چلا گیا اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ان ذرات کی حرارت اور ان کے باہمی کشش ثقل کی قوت وشدت میں کمی آتی چلی گئی۔ پھر یہ ناری ہیولیٰ یا بگولا مختلف حصوں میں پھٹتا چلا گیا جس سے کہکشائیں وجود میں آئیں اور ہر کہکشاں میں ناری کُرے پیدا ہوئے۔ آہستہ آہستہ بہت سے کرے ٹھنڈے پڑنے شروع ہوئے‘ جن میں سے ایک ہماری زمین بھی ہے۔ اس سارے عمل میں کروڑہا برس لگے ہیں۔ ہماری زمین جب ٹھنڈی ہوئی تو اس کے اوپر مٹی کی ایک دبیز تہہ پیدا ہو گئی جسے ’’قشرِ ارض‘‘ یعنی زمین کا چھلکا (Crust of the Earth) کہا جاتا ہے۔ زمین کے اندر تو اب بھی آگ بھری پڑی ہے۔ زمین کے پیٹ میں تو اس قدر درجہ حرارت ہے کہ وہاں معدنیات پگھلی ہوئی صورت میں ہیں۔ اس کے اندر سے جب لاوا ابلتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس زمین کے اندر کیا قیامت مخفی ہے۔

تخلیق کائنات کے طویل پراسیس کو میں نے تنزلات میں شمار کیا ہے۔ ایک تنزلات تو وہ ہیں جو ہمارے قدیم فلسفے کے اندر آتے ہیں۔ ایک تنزلات وہ ہیں جو ہمارے صوفیاء نے معین کیے ہیں اور ایک تنزلات وہ ہیں جو میں نے بیان کیے ہیں‘ جن کا تعلق قرآن اور سائنس کے ساتھ ہے۔ میں نے ان مباحث کو اپنے ایک کتابچے میں تفصیل سے بیان کیا ہے‘ جس کا عنوان ہے ’’ایجاد وابداعِ عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک تنزل اور ارتقاء کے مراحل‘‘۔ اس کائنات میں جو سٹارز اور کُرے موجود ہیں‘ ان میں ثوابت (stars) بھی ہیں اور سیارے (satellites) بھی۔ ’’ثوابت‘‘ وہ ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ساکن ہیں‘ لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ بھی کم از کم اپنے محور پر گھوم رہے ہیں۔ سورج بھی سٹار ہے‘ لیکن اپنے گرد گھوم رہا ہے۔ آج ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کائنات میں سکون نام کی کوئی شے نہیں ہے ؏ ’’سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں!‘‘ کائنات کی ہر شے حرکت میں ہے‘ جس کو قرآن نے بتکرار کہا ہے:

﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ (الانبیاء:۳۳ و یٰسٓ :۴۰) ''ہر شے اپنے مدار میں تیر رہی ہے''۔ اس حقیقت کو تو قرآن نے کھولا' ورنہ یہی سمجھا جاتا تھا کہ دراصل زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں جا کر غروب ہو جاتا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ نہیں' سورج تو ساکن ہے' زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ سورج بھی گھوم رہا ہے اور اس کی بھی دو حرکتیں ہیں۔ یہ کسی اور بڑے سٹار کے گرد بھی چکر لگا رہا ہے' جس کا ابھی تک سراغ نہیں لگایا جا سکا' اور اپنے محور (axis) پر بھی گھوم رہا ہے۔ جیسے زمین اپنے محور پر بھی گھوم رہی ہے' جس سے دن رات وجود میں آتے ہیں اور یہ سورج کے گرد بھی چکر لگاتی ہے تو اس سے موسم وجود میں آتے ہیں۔

تخلیق کائنات میں کتنا عرصہ لگا' آپ تصور نہیں کر سکتے۔ قرآن اس عرصے کو چھ دن کہتا ہے' لیکن یہ ہمارے چوبیس گھنٹے کے دن نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں ایک دن کا ذکر ہے ہزار سال کا' ایک دن کا ذکر ہے پچاس ہزار سال کا' جبکہ یہ کروڑوں سال کا ایک دن ہے' یہ آفاقی دن ہے۔ پوری کائنات کی حرکت کے اعتبار سے شاید وہ ایک دن بنتا ہو۔ واللہ اعلم! تو جب تک کہ وہ ناری کرے ٹھنڈے ہوئے اور زمین پر crust ظاہر ہوئی' جیسے انگارے کے اوپر راکھ آ جاتی ہے' تو اس میں کروڑہا برس لگ گئے۔ تو یہ عالمِ خلق کی تدریج ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے: ؎

مت سہل ہمیں جانو' پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے!

اس شعر میں ''برسوں'' کی جگہ ''صدیوں'' رکھ لیجیے۔ اس کائنات نے کتنے تنزلات طے کیے ہیں' تب خاک وجود میں آئی اور خاک سے انسان کا ہیولیٰ بنا۔ اس بات پر سائنس اور مذہب دونوں متفق ہیں کہ انسان مٹی سے بنایا گیا ہے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے' سائنس بھی یہی کہتی ہے۔ البتہ مٹی سے اس کی تخلیق کس پراسیس کے تحت ہوئی ہے' یہ بات اختلافی ہو سکتی ہے۔ بہرحال ہمارا حیوانی وجود' جس کا تعلق عالمِ خلق سے ہے' اس کا مادۂ تخلیق مٹی ہے۔ قرآن حکیم میں انسان کے مادۂ تخلیق کے لیے کہیں تُراب' کہیں طِیْن'

کہیں طِیْنٍ لَّازِبٍ، کہیں صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ اور کہیں صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی کہیں فرمایا کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی، کہیں فرمایا گارے سے، کہیں سنے ہوئے لیس دار گارے سے، کہیں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے اور کہیں ٹھیکری کی طرح کھنکھناتے ہوئے گارے سے۔ گویا حیوانِ آدم کی تخلیق سے پہلے اس کے مادۂ تخلیق ''مٹی'' اور اس کے منبع حیات ''پانی'' کے امتزاج سے وجود میں آنے والے ''گارے'' نے ارتقاء کے کتنے ہی مراحل طے کیے۔ مرزا بیدلؒ نے اس مضمون کو کس خوبصورتی سے شعر کا جامہ پہنایا ہے:۔

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی
اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہوشیار باش!

یعنی یہ پوری کائنات جب تنزلات کی منزلیں طے کر کے خاک تک پہنچ گئی تب انسان کا ہیولیٰ بننا شروع ہوا۔

اس شعر کا دوسرا مصرع سمجھنے کے لیے آپ کو فلسفۂ وجود سمجھنا پڑے گا۔ نظریۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود وغیرہ کی رو سے یہ کائنات اصل میں خیالی ہے، اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے، گویا یہ معدوم کے درجے میں ہے۔ حقیقی وجود یا وجودِ مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے اسے آپ سائے کی طرح سمجھ لیجیے۔ آپ شیشے کے سامنے کھڑے ہیں تو اُدھر بھی کھڑے نظر آ رہے ہیں، جبکہ وہاں پر شیشے کے پیچھے کچھ نہیں ہے، یہ تو محض آپ کا عکس ہے جو نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ کائنات کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

کلُّ ما فی الکون وھمٌ او خیال
او عکوسٌ فی المرایا او ظلال

یعنی کائنات میں جو کچھ ہے وہ وہم ہے یا خیال ہے، یا آئینے کے اندر نظر آنے والے عکس ہیں یا محض سائے ہیں۔ جیسے درخت کا سایہ زمین پر پڑ رہا ہے، اس سائے کا اپنا تو کوئی وجود نہیں ہے۔ تو یہ جو معدوم (کائنات) ہے اس معدوم کی بہار انسان ہے۔ اس تخلیق کا

کلائمکس انسان ہے۔ اس حوالے سے مرزا بیدلؒ انسان کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ اپنی قدر و قیمت سے آگاہی حاصل کرو۔ یہ کائنات معدوم ہے' لیکن اس کا کھلا ہوا گلاب کا پھول انسان ہے۔ اس کائنات نے تنزل کی کتنی ہی منزلیں طے کی ہیں' کتنا نیچے اتری ہے' تب انسان کا نقش پیدا ہوا ہے۔

نبوت و رسالت کا تدریجی ارتقاء

انسان کی تخلیق کے بعد تدریج اور ارتقاء کا ایک اور مرحلہ شروع ہوا اور وہ ہے نبوت و رسالت کا ارتقاء۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے' پہلے نبی بھی تھے اور پہلے رسول بھی۔ لیکن نبوت و رسالت کی تکمیل تقریباً چھ سات ہزار برس کی تدریج کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ اس لیے کہ یہ عالمِ خلق ہے اور عالمِ خلق کے اندر وقت لگتا ہے۔ جیسے جیسے انسان کا ذہنی ارتقاء ہوا' نبوت و رسالت کا بھی ارتقاء ہوا۔ جیسے انسان کا عہد طفولیت ہوتا ہے اور پھر وہ رفتہ رفتہ پروان چڑھتا ہے تو اس کا ذہنی شعور بھی پختہ ہوتا جاتا ہے۔ پرائمری کے ایک بچے کو آپ پی ایچ ڈی ٹیچر رکھ دیں تب بھی وہ اسے کیا پڑھائے گا؟ وہی کچھ نا جس کی اس بچے میں استعداد ہے! وہ اپنا پی ایچ ڈی کا علم زبردستی اس کے اندر نہیں انڈیل سکتا۔ اسی طرح انسان نے دنیا میں ارتقاء کے مراحل طے کیے' ذہنی طور پر بھی اور تمدنی اعتبار سے بھی۔ پہلے یہ غاروں میں رہتا تھا' پھر اس نے جھونپڑیاں بنانا شروع کیں۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر قبائل کی شکل اختیار کی۔ قبیلے کا نظام بنا۔ پھر شہری ریاستیں وجود میں آئیں۔ پھر بڑی بڑی امپائرز وجود میں آ گئیں۔ یہ انسان کا ذہنی اور تمدنی ارتقاء ہے۔ یہ دونوں ارتقاء جب اپنی پختگی (maturity) کو پہنچ گئے تو ساتھ ہی نبوت و رسالت کی بھی تکمیل ہو گئی۔ اس ارتقاء میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کم از کم چھ سات ہزار سال کا فصل ہے۔ آدم نما مخلوق تو بہت پرانی شے ہے جس کا ذکر ڈارون کرتا ہے' اور اخبارات میں آتا رہتا ہے کہ اتنے لاکھ سال پرانا فاسل (fossil) نکل آیا ہے' جس کا جبڑا بالکل انسان کے جبڑے کی مانند ہے۔ یہ انسان نما مخلوق تو بہت پہلے تھی' لیکن ایک خاص انسان (Homo sapiens) جس میں

اللہ نے اپنی روح میں سے پھونکا‘ وہ ایک شخص آدم تھا۔ وہ آدم دس ہزار سال سے پرانی شخصیت نہیں ہے۔ بہرحال حضرت آدم علیہ السلام سے نبوت و رسالت کا جو سفر شروع ہوا تو وہ تقریباً چھ سات ہزار سال میں حضرت محمد ﷺ پر تکمیل کو پہنچ گیا۔

نبوت و رسالت کا جو ارتقاء (evolution) ہوا ہے‘ اس میں دو پہلو ہیں۔ نبوت کی انتہا ہدایت اور دین حق کا اِتمام و اِکمال ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ﴾ (المائدۃ:۳) ’’آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اِتمام کر دیا‘‘۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو دو چیزیں دی گئی ہیں: الہدیٰ اور دینِ حق۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ..... ﴾ (التوبۃ:۳۳‘ الفتح:۲۸‘ الصّف:۹) ’’وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر......‘‘ ہدایت قرآن کی شکل میں مکمل ہو گئی اور دین حق (اسلام) کی صورت میں اللہ نے ایک کامل تمدنی نظام عطا فرما دیا۔ یہ دین اللہ نے ہمیشہ کے لیے مکمل کر دیا ہے اور اب یہی دین قابل قبول ہے: ﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟ قف﴾ (آل عمران:۱۹) ’’اللہ کے نزدیک (معتبر اور مقبول) دین صرف اسلام ہے‘‘۔ اور یہ بھی فرما دیا کہ: ﴿وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ﴾ (آل عمران:۸۵) ’’جو شخص بھی اسلام کے سوا کسی اور دین کی پیروی کرے گا اس سے وہ قبول نہیں کیا جائے گا‘‘۔ اسے ردّ کر دیا جائے گا۔ تو یہ بھی ایک ارتقاء کا عمل ہے۔

سورۃ المدثر کی آیات ۳۲۔۳۶ کی وجدانی تشریح

اب ان آیات کی طرف آیئے جو میں نے آغاز میں تلاوت کی تھیں۔ ان آیات میں نبوت و رسالت کے ارتقاء اور اس کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے۔ میں ان آیات کی تفسیر بیان نہیں کر رہا‘ بلکہ میرے سامنے ان کی جو اذعانی اور وجدانی (intutive) شرح آئی ہے وہ بیان کر رہا ہوں۔ سورۃ المدثر کی آیات میں رسول اللہ ﷺ پر نبوت و رسالت کی تکمیل کا مضمون ہے۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے پہلے بھی ہدایت دنیا میں موجود تھی‘ لیکن

ابھی ناقص تھی۔ظاہر بات ہے کہ چاند پورا بھی ہو جائے تو سورج کے برابر روشن نہیں ہو جاتا۔فرمایا: ﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ﴿٣٢﴾﴾ ''ہرگز نہیں' قسم ہے چاند کی!'' جس طرح چاند طلوع ہوتا ہے اور تدریجاً بڑھتے بڑھتے چودہ دنوں میں جا کر مکمل ہوتا ہے اسی طرح ہدایت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ تک مکمل ہو رہی تھی۔

﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ﴿٣٣﴾﴾ ''اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ پیٹھ موڑ کر چل دے''۔اس میں اشارہ کس کی طرف ہے؟ دراصل حضور ﷺ کی بعثت سے قبل ایک طویل رات گزری ہے جس میں کوئی نبوت' کوئی رسالت دنیا میں نہیں تھی۔حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اس زمین پر کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا جب کوئی نہ کوئی نبی موجود نہ ہو۔ نبوت ہمیشہ موجود رہی۔ایک ایک وقت میں کئی کئی نبی بھی رہے۔ہمیں جو تاریخ بتائی گئی ہے وہ تو صرف ایک خاص علاقے میں آنے والے نبیوں سے متعلق ہے' یعنی مڈل ایسٹ' خاص طور پر فلسطین اور اس کے اردگرد کا علاقہ' جبکہ قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے کہ: ﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ﴾ (النساء: ١٦٤) ''اور (اے نبیؐ!) ہم نے اُن رسولوں پر (بھی وحی بھیجی) جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے آپ سے بیان کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا''۔قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴿٧﴾﴾ (الرعد) ''اور ہم نے ہر قوم میں ایک ہادی بھیجا ہے''۔کیا چین میں قوم آباد نہیں تھی؟ کیا روس میں لوگ نہیں بستے تھے؟ کیا یورپ غیر آباد تھا؟ ان خطوں میں بھی یقیناً نبی آئے ہوں گے۔ہوسکتا ہے کنفیوشس نبی ہو' لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ ایک خیال یہ ہے کہ گوتم بدھ اور کرشن جی نبی تھے۔ایسا عین ممکن ہے' لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔آپ اندازہ کیجیے کہ سوا لاکھ نبی آئے ہیں جبکہ قرآن مجید میں صرف ۲۷ یا ۲۸ کا ذکر ہے۔اسی طرح ۳۱۳ رسول تھے جن میں سے قرآن میں صرف پانچ یا سات کا ذکر ہے۔رسولوں میں حضرت نوح علیہ السلام ہیں' حضرت ہود ہیں' حضرت صالح ہیں۔ان کے بعد حضرت ابراہیم ہیں۔پھر نہ تو حضرت اسحاق رسول ہیں' نہ حضرت یعقوب رسول

ہیں‘ نہ حضرت یوسف رسول ہیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ رسول آئے ہیں۔ موسیٰؑ کے بعد بے شمار انبیاء آئے اور پھر عیسیٰؑ رسول آئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد آخری نبی اور رسول حضرت محمد ﷺ آئے۔ چنانچہ دنیا میں ہر جگہ پر یقیناً نبوت و رسالت کا سلسلہ رہا ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ سے حضور ﷺ تک چھ سو برس کی تاریک رات آئی جب کوئی نبی اور رسول نہیں تھا۔ یہ ہے وہ رات! لیکن اب حضور ﷺ کی آمد پر وہ رات ختم ہو رہی ہے۔ اب اس رات نے پیٹھ موڑ لی ہے۔ ﴿ وَالصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿۳۴﴾ ﴾ ’’قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو گئی ہے‘‘۔ وہ بعثت محمدیؐ کی صبح ہے۔ اب سورج طلوع ہو رہا ہے جس کی روشنی چار دانگ عالم میں پہنچے گی۔ (ان آیاتِ مبارکہ کا بعثت محمدی ﷺ سے تعلق اس سے بھی ظاہر ہے کہ سورۃ المدثّر کا آغاز آنحضور ﷺ کی بعثت کے ذکر سے ہوا ہے!)

﴿اِنَّهَا لَاِحۡدَى الۡكُبَرِ ﴿۳۵﴾ ﴾ ’’یہ یقیناً بہت بڑی باتوں میں سے ہے‘‘۔ معلوم ہوا کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور نزولِ قرآن بہت بڑی باتوں میں سے ہے۔ کروڑہا سال گزر کر یہ مرحلہ آیا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا سورج طلوع ہوا ہے۔ میں جب ان آیات کو پڑھتا ہوں تو وجد میں آ جاتا ہوں۔ ان کے اندر جو کیفیات ہیں‘ اگر ان کو انسان وجدانی طور پر محسوس کرے تو وجد میں کیوں نہ آئے!

﴿نَذِيۡرًا لِّلۡبَشَرِ ﴿۳۶﴾ ﴾ ’’انسان کو خبردار کرنے کے لیے‘‘۔ محمد ﷺ پوری نوعِ انسانی کے لیے نذیر بن کر آئے ہیں۔ یہ تکمیل رسالت کا مظہر ہے۔ تو اس اعتبار سے تکمیل نبوت کیا ہے؟ آپؐ کو کتاب بھی دے دی گئی جس میں ہدایت کامل ہے۔ اور دینِ حق کامل بھی دے دیا گیا۔ اور رسالت کی تکمیل کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ کہ آپؐ نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ حجۃ الوداع میں خطبہ کے موقع پر آپؐ نے پوچھا کہ: ((اَلَا هَلۡ بَلَّغۡتُ؟)) ’’لوگو! میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟‘‘ اس موقع پر سوا لاکھ کا مجمع تھا‘ اس دنیا میں جتنی تعداد انبیاء کی آئی ہے اتنی ہی تعداد میں اُس وقت حضور ﷺ کے سامنے صحابہؓ تھے۔ سب کا جواب یہی تھا کہ اِنَّا نَشۡهَدُ اَنَّكَ قَدۡ بَلَّغۡتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّيۡتَ الۡاَمَانَةَ وَنَصَحۡتَ الۡاُمَّةَ وَكَشَفۡتَ الۡغُمَّةَ. حضورؐ! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے رسالت کا حق

ادا کر دیا' اللہ کی امانت کا حق ادا کر دیا۔ (یہ قرآن آپ کے پاس امانت آیا تھا' جو آپؐ نے ہم تک پہنچا دیا) آپؐ نے اُمت کا حق نصیحت ادا کر دیا اور تاریکیوں کے پردے چاک کر دیئے''۔ لیکن جیسا کہ میں نے بتایا' نبوت کو یہاں تک پہنچنے میں چھ سات ہزار سال لگے۔

تجدید دین کا ارتقاء

محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بعد چودہ صدیاں بیت گئی ہیں اور ان صدیوں میں مجدد دین آتے رہے ہیں۔ البتہ مجددِ کامل کوئی نہیں آئے۔ ختم نبوت سے جو خلا پیدا ہوا' اللہ نے اس کو تین چیزوں سے پُر کر دیا۔ اوّلاً: قرآن میں کامل ہدایت نازل فرمائی اور اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا۔ ثانیاً: ہر صدی میں ایک مجدد بھیجنے کا اہتمام فرمایا۔ علماء کا قول ہے جو کہ صحیح بھی ہے کہ ایک صدی میں ایک سے زائد مجدد دین بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ چھوٹے چھوٹے مجدد بھی ہو سکتے ہیں۔ ثالثاً یہ کہ ہر زمانے میں ایک جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔ اب جو حق کا متلاشی ہے جماعت کو تلاش کرنا اس کا کام ہے۔ یہ گھر بیٹھے نہیں مل جائے گی' اس کے لیے تلاش کرنی پڑے گی۔ زمانۂ طالب علمی میں ایک نظم پڑھی تھی بزع **فَتِّش لقلبک عن رفیقٍ** کہ اپنے دل کے لیے کوئی دم ساز' کوئی رفیق تلاش کرو' کوئی ایسا آدمی ہو جس سے آپ دل کی بات کہہ سکیں تاکہ بوجھ ہلکا ہو جائے' ورنہ اس کا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے۔ اسی طرح: **فتش لِذاتِکَ عن جماعۃٍ** تلاش کرو اس جماعت کو! یہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ دنیا کبھی اس جماعت سے خالی نہیں ہوگی۔ تاہم جماعت کے عنوان بدلتے رہیں گے۔ جیسے شیر شاہ سوری کے ڈاک کے نظام میں ہر تیس میل پر گھوڑا اور سوار بدل جاتے تھے' لیکن ڈاک کا تھیلا وہی رہتا تھا جو ایک گھوڑے سے دوسرے گھوڑے پر منتقل ہو جاتا تھا۔ اسی طرح دین چودہ صدیوں سے اپنی اصلی حالت میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اب یہ پندرہویں صدی تجدید کامل کی صدی ہے۔

آنحضور ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی جو محنت و مشقت اور قربانیاں تھیں اس کے نتیجے میں دنیا کے سامنے خلافت کا ایک نظام قائم کر کے دکھا دیا

گیا۔ اس سے دو حجتیں قائم ہو گئیں۔ اگرچہ وہ نظام کامل شکل میں صرف تیس برس رہا ہے' پھر رفتہ رفتہ اس میں زوال شروع ہو گیا۔ ع خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود! سب سے پہلے سیاسی نظام گر گیا اور موروثی بادشاہت آ گئی۔ ﴿اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ﴾ کا تصور ختم ہو گیا' لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ عالمی نظامِ خلافت آج بھی پوری عالمِ انسانیت پر حجت ہے کہ دیکھو یہ نظام قائم ہوا تھا۔ البتہ ہم پر جو جوابی حجت قائم کی جاتی ہے کہ وہ نظام اب دکھاؤ کہیں' تو اس پر ہم خاموش ہو جاتے ہیں۔ بہرحال یہ تاریخی حقیقت سب مانتے ہیں' بدترین دشمنِ رسول اور شاتمِ رسول ایچ جی ویلز بھی مانتا ہے۔ اس نے رسالت مآب ﷺ کی شانِ اَقدس میں گستاخانہ تحریریں لکھی ہیں جیسے کہ رشدی ملعون نے لکھی ہیں' لیکن ایک جگہ آ کر گھٹنے ٹیک کر تسلیم کرتا ہے کہ ''اگرچہ دنیا میں انسانی اخوت و مساوات اور حرّیت کے وعظ تو پہلے بھی بہت کیے گئے تھے' حضرت مسیحؑ کے ہاں بھی بہت سے وعظ ہمیں مل جاتے ہیں' لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ صرف محمد (ﷺ) کی شخصیت ہے جس نے ان اصولوں پر مبنی ایک معاشرہ قائم کر کے دکھا دیا''(۱)۔ یہ حجت ہے نوعِ انسانی پر۔ دوسری حجت مسلمانوں پر ہے کہ دیکھو انسانی جدوجہد سے یہ نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اب اس نظام کو دوبارہ قائم کرنا تمہارے ذمے ہے۔ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پیٹ پر پتھر باندھنے پڑے تھے۔ بہت سے صحابہؓ کی جانیں قربان ہوئیں۔ خون تو حضور ﷺ کا بھی بہا ہے' اگرچہ آپؐ کی خواہش اور تمنا تو یہ تھی کہ اللہ کی راہ میں بار بار سر کٹانے کا موقع ملے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ)) (صحیح البخاری)

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا

---

(۱) یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ اقتباس ایچ جی ویلز کی کتاب A Concise History of the World کے پرانے ایڈیشن سے ہے۔ موجودہ ایڈیشن کے مرتبین نے اسے خارج کر دیا ہے۔

جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں''۔

لیکن یہ اللہ کا قانون ہے کہ رسول قتل نہیں ہو سکتے۔ از روئے نص قرآنی: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ﴾ (المجادلة: ۲۱) ''اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول لازماً غالب آ کر رہیں گے''۔ چاہے اس شکل میں آئیں کہ سارے کفار کو فنا کر دیا جائے اور رسول اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا جائے۔ جیسے قومِ نوحؑ، قومِ ہودؑ، قومِ صالحؑ اور قومِ شعیبؑ کے ساتھ ہوا، صدوم اور عامورہ کی بستیوں کے ساتھ ہوا۔ بہر حال نوعِ انسانی پر ایک حجت قائم ہوئی کہ یہ بہترین نظام ہے۔ دوسری حجت مسلمانوں پر قائم ہوئی ہے کہ انسانی محنت، جدوجہد اور جان کی قربانی کے ذریعے تم بھی یہ نظام قائم کر سکتے ہو۔

سورۃ الانشقاق کی آیات ۱۴۔۱۹

تجدید دین کے ارتقاء اور اس کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے قرآن کے دوسرے مقام (سورۃ الانشقاق) میں، جس پر میں جھوم اٹھتا ہوں۔ یہاں بھی رات کا ذکر بھی ہے اور چاند کا بھی۔ ان دونوں مقامات کے اندر یہ چیز مشترک ہے۔ فرمایا: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ﴿۱۶﴾﴾ ''تو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی''۔ جب سورج غروب ہو جائے لیکن اس کی روشنی بادلوں سے منعکس ہو کر آسمانوں کو سرخ کر رہی ہو تو اسے شفق کہتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک بطورِ دین اسلام کا سورج غروب ہو چکا ہے، ہاں شفق باقی رہ گئی ہے: ﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ﴿۱۷﴾﴾ ''اور قسم ہے رات کی اور اُن چیزوں کی جس کو وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے''۔ یہ سیاہ رات کوئی چار سو برس کی ہے۔ سورۃ المدثر میں ﴿وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ﴿۳۳﴾﴾ کے الفاظ آئے تھے جبکہ یہاں کہا گیا: ﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ﴿۱۷﴾﴾ ''اور قسم ہے رات کی اور جو کچھ وہ جمع کر لیتی ہے''۔ رات چوروں اور ڈاکوؤں کو بھی ڈھانپ لیتی ہے، سانپ بچھو بھی نکل آتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جن کی طرف اشارہ ہے، انہیں آئندہ بیان کیا جائے گا۔

﴿وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ﴿۱۸﴾﴾ ''اور قسم ہے چاند کی جب وہ رفتہ رفتہ پورا ہو جاتا ہے''۔ جس طرح چاند چودہ دن میں پورا ہوتا ہے اسی طرح اسلام کی کامل تجدید کو چودہ

صدیاں لگی ہیں۔ اب تجدید کامل کا وقت آ پہنچا ہے۔ پندرہویں صدی ہجری کے مجدد مہدی ہوں گے‘ جن کی خبر دی گئی ہے۔ البتہ ان کا راستہ ہموار کرنے کے لیے پہلے چھوٹی چھوٹی کوششیں ہوں گی۔ کہیں اسلام کا نظام عدلِ اجتماعی قائم ہوگا جہاں سے فوجیں حضرت مہدیؑ کی حکومت قائم کرنے کے لیے جائیں گی۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اسلام کی تعلیمات دنیا میں ایسے رہ گئی تھیں جیسے شفق ہوتی ہے۔ دین کا سورج غروب ہو چکا تھا اور پھر رات آ ئی تھی۔ جیسے چاند کی روشنی مستعار ہوتی ہے اسی طرح مجدد دین کی روشنی بھی اپنی نہیں ہے‘ بلکہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے مستعار ہے۔ لہٰذا یہ چاند ہے اور چاند چودہ راتوں میں جا کر مکمل ہوتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا: ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾﴾ ’’تم یقیناً درجہ بدرجہ اُوپر اٹھو گے‘‘ یعنی یہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام جب ایک دفعہ غروب ہونے کے بعد چاند کی شکل میں نکلے گا تو چودہ صدیوں میں سیڑھی کے درجوں کی طرح تدریجاً اس کی تجدید کامل کا مرحلہ آئے گا۔ کائنات کی تخلیق میں تدریج ہے‘ انسان کی تخلیق میں تدریج ہے‘ نبوت و رسالت کی تکمیل میں تدریج ہے اور اس کے بعد آخر میں خلافت کا نظام قائم ہونے میں بھی تدریج ہو گی‘ یہاں تک کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ پوری دنیا پر قائم ہو کر رہے گی۔ (سورۃ الانشقاق کی اِن آیاتِ مبارکہ کا تعلق دینِ حق کی تدریجی تجدید کے ساتھ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس سورت کا آغاز قیامت کے ذکر سے ہوا ہے‘ اور دین کی کامل تجدید اس کے قریب کے زمانے میں ہی ہو گی‘ اور اس ضمن میں ’’لَتَرْكَبُنَّ‘‘ میں جو صیغہ جمع کا وارد ہوا ہے کہ یہ اُمتِ مسلمہ کا معاملہ ہے۔ جبکہ سورۃ المدثر میں صیغۂ واحد میں استعمال ہوا ہے‘ اس لیے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے متعلق ہے۔)

تجدید کامل کا مرحلہ اور ہماری ذمہ داریاں

یوں سمجھئے کہ ملت اسلامی کا قافلہ چودہ سو برس کے اندر آنے والے جزوی مجددین سے گزرتے ہوئے تجدید کامل کے مرحلے پر کھڑا ہے۔ اب اللہ کا دین پورے کا پورا

کامل صورت میں پوری دنیا میں دوبارہ قائم ہوگا۔ اب چونکہ دنیا گلوبلائز ہو چکی ہے لہٰذا یہ نظام کل روئے ارضی پر قائم ہوگا۔ ابھی اس قافلے کے لیے جزوی کوششیں ہو رہی ہیں۔ خاص طور پر برعظیم پاک و ہند میں جو کوششیں ہوئی ہیں' اس لڑی میں تنظیم اسلامی بھی شامل ہے۔ یہ کوئی آسمان سے نہیں گری ہے' بلکہ اس کا بھی تدریجی ارتقاء ہوا ہے۔ علامہ اقبال نے اس فکر کو تازہ کیا کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ ابوالکلام آزاد نے (۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک) حزب اللہ قائم کی۔ اس کے بعد مولانا مودودی آئے اور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء تک وہ اسی اصولی انقلابی جدوجہد میں لگے رہے۔ اس کے بعد ان کی جماعت انتخابی سیاست کے اکھاڑے میں کود پڑی۔ پھر ہم نے اس کام کو شروع کیا ہے۔ تو یہ اصل میں تدریجی ارتقاء ہے۔ ابھی ہوسکتا ہے ایک دو نسلیں اور بیت جائیں' لیکن اس کے بعد لازماً پوری دنیا پر خلافت کا سورج طلوع ہوگا' جو اپنی نورانی تعلیمات اور نظامِ عدلِ اجتماعی کے ذریعے روئے ارضی کو منور کر دے گا۔ بقول علامہ اقبال ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

یہ ہو کر رہے گا ـــــ اور تنظیم اسلامی درحقیقت اسی کی ایک کڑی ہے۔ اسی کی جدوجہد کرنے کے لیے ایک ہیئت تنظیمی ہے۔ اب یہ کام آپ لوگوں کا ہے کہ اس کے فکر کو پرکھیں' اس کے اہداف کیا ہیں ان کا شعور حاصل کریں۔ تنظیم کے طریقہ کار کو سمجھیں' اس کے نظامِ تربیت اور تزکیہ سے آگاہ ہوں۔ یہ تفتیش اور تحقیق بھی جہاد فی سبیل اللہ کا ایک حصہ ہے۔ جب نیت یہ ہو کہ ہمیں اس کام میں لگنا ہے تو دیکھنا چاہیے کہ کون سی جماعتیں اس میدان میں برسرعمل ہیں۔ ان جماعتوں میں آپ تلاش کیجیے۔ وہ حدیث میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت لازماً حق پر قائم ہوگی۔ اس سے کوئی استثناء نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی جماعت تو موجود ہے' اس کو تلاش کرنا آپ کا کام ہے!

اقول قولی هذا واستغفرالله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

مسلم قومیت کا تصور اور تحریک پاکستان کا اصل عامل

پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد کے افکار کا جائزہ

از ڈاکٹر اسرار احمد

روزنامہ ''نوائے وقت'' کے پاکستان کے مختلف مقامات سے شائع ہونے والے جملہ ایڈیشنوں میں پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد صاحب (جو اس وقت انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے ریکٹر ہیں) کی ایک طویل تحریر ''پاکستان!'' کے عنوان سے تین اقساط میں (۲۴ تا ۲۶ راگست) شائع ہوئی تھی۔ جس کے آخر میں اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں درج کیا گیا تھا:

''مندرجہ بالا باتوں کا اگر خلاصہ کیا جائے تو کچھ اس طرح ہوسکتا ہے:

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کا مسئلہ ان کے حقوق کا تحفظ اور آبادی کے لحاظ سے ملک کے نظم ونسق کو چلانے میں ان کا حصہ تھا۔ یہاں تک تو بات واضح اور غیر مبہم ہے۔

(۲) لیکن پاکستان بنانے کا مقصد مبہم اور غیر واضح تھا اور متضاد محرکات کا شکار تھا۔ مزید مسلمانوں کا بنیادی تشخص زبان، نسل اور قوم کا تھا ''پاکستانیت'' کا نہیں۔

(۳) اگر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا معاملہ تھا تو اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں تھا کہ پاکستان بننے کی صورت میں ان کا تقریباً ایک تہائی حصہ اس احساسِ تحفظ سے بھی محروم ہو جائے گا، جو اس کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے ایک ہی ریاست میں رہنے کی صورت میں حاصل ہوگا۔

(۴) اگر پاکستان بنانے کا مقصد ''اسلام'' تھا تو اس کے خدوخال کیا تھے؟ کیا وہ جو قائداعظم کی مختلف اوقات میں کی گئی تقریروں میں مبہم انداز میں ملتا ہے، یا وہ جس کی وکالت مولانا مودودیؒ کر رہے تھے، یا سیدھا

سادا روایتی شریعت کا نفاذ تھا جس کا تجربہ افغانستان میں ہوا۔

(۵) جنگ عظیم کے بعد کی عالمی منصوبہ بندی کے پیش نظر اس نوزائیدہ ریاست کے عمومی اہداف کا رخ کیا ہوگا؟

(۶) بیسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کے متوقع سیاسی اور سماجی نظاموں کے ساتھ، جن میں سرمایہ دارانہ اور جمہوری اقدار بالادست ہوں گی، نبرد آزما ہونے کا رخ کیا ہوگا؟ اگر جمہوری رخ اختیار کرنا ہو تو اس کے اور اسلامی رخ کے بنیادی تضادات کے حل کا طریقہ کیا ہوگا؟

پاکستان کے بنیادی تصور کا یہ ابہام ہر قسم کی تعبیر و تشریح کے امکانات کو کھلا چھوڑ دیتا ہے جس کے نتیجے میں انتشارِ فکری کے ساتھ مرکز گریز تصورات کو آسانی سے دَر آنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں''۔

اس پر ایک ''تبصرہ'' بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تحریر فرمایا تھا جو 'نوائے وقت' کی اتوار کی دو خصوصی اشاعتوں (سنڈے میگزین ۲۱ اور ۲۸ ستمبر) میں شائع ہوا تھا ـــــ یہ بحث ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اولاً ڈاکٹر صاحب کی طبیعت علیل ہوگئی اور اس کے بعد بعض سفر پیش آ گئے۔ چنانچہ تحریر کا سلسلہ رک گیا ـــــ اب ان شاء اللہ جلد ہی اسے مکمل کر لیا جائے گا۔ تاہم سردست متذکرہ بالا دو اقساط کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد اور اِن سطور کا ناچیز راقم دونوں نوجوانی کے دَور میں ع ''ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق'' کے مصداق ایک ہی دینی تحریک (اسلامی جمعیت طلبہ۔ جماعت اسلامی) سے منسلک رہے۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھے، جن کے چہرے کے گرد ایک خشخشی داڑھی کا فریم بھی خوب سجتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ، وہ نہایت ہنس مکھ بھی تھے اور ہمیشہ ہنسی مذاق اور دل لگی میں مصروف نظر آتے تھے، اور ان سب پر مستزاد ہمارے ہم جولیوں کے پورے حلقے پر ان کا یہ ''رعب'' بھی تھا کہ وہ زمانہ طالب علمی میں بھی اکبرالٰہ آبادی کے بقول ''بی بی پاس'' بھی تھے، جبکہ باقی ہم سب گویا اس کلب کے ''امیدوارانِ رکنیت'' میں شامل تھے ـــــ البتہ ساتھ ہی وہ تحریک کے فعال کارکن بھی تھے ـــــ لیکن اس کے بعد ع ''اُو بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم'' کے مصداق وہ تو فلسفہ اور منطق کے وسیع و عریض ''صحرا'' کی بادیہ پیمائی میں مصروف ہو گئے، جس سے ابتداءً ''حکمت یونانیاں'' کی وساطت سے وسعتِ فکر و نظر اور

بعد میں کسی قدر آزاد خیالی اور ''لبرل ازم'' کی پہنائیوں میں ''گم'' ہو کر علامہ اقبال کے اُس شعر کے مصداق بن گئے جو انہوں نے ''ایک فلسفہ زدہ سید زادہ کے نام'' کہا تھا' یعنی ؎

''تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا ـــــ زُنّاریٔ برگساں نہ ہوتا'' ـــــ چنانچہ منظور صاحب بھی فلسفے کی زُنّاری کے باعث کم از کم اپنی ''تحریکی خودی'' کھو بیٹھے ـــــ اُدھر مجھے اس کے برعکس قرآنِ مجید کے جمال وجلال نے اپنا ''اسیر'' (possess) کر لیا ـــــ اور میں مولانا رومؒ کے اس شعر کے مطابق کہ: ''چند خوانی حکمتِ یونانیاں ـــــ حکمتِ قرآنیہ را ہم بخواں!'' ایک جانب قرآنِ حکیم کے فلسفہ وحکمت یعنی حکمتِ قرآنیہ یا حکمتِ ایمانیہ کے پڑھنے پڑھانے میں' اور دوسری جانب قرآن کے انقلابی پیغام کی نشر واشاعت اور ابلاغ وتبلیغ میں' اور تیسری جانب ایک اسلامی انقلابی جماعت کی تأسیس وتشکیل کی جدوجہد میں ہمہ تن وہمہ وقت وقف ہو گیا!

بعد میں منظور صاحب نے اوّلاً اپنی ذہانت' قابلیت اور محنت کے ذریعے علمی اور بالخصوص تعلیمی میدان میں بہت ترقی کی' اور ثانیاً جب سابق صدر مشرف کے دورِ حکومت میں' کچھ ان کی اپنی ذاتی اُپج اور کچھ عالمی طاقتوں کے اشارے پر' پاکستان میں ''مذہبی انتہا پسندی'' کے خلاف اور ''جدید مغربی روشن خیالی'' کے حق میں جہاد کے لیے امریکہ کی مشہور رینڈ (RAND) کارپوریشن کی اصطلاح کے مطابق ''ماڈرنسٹ'' دانشوروں کی ضرورت پیش آئی تو بعض دوسرے دانشوروں کے ساتھ ساتھ قرعۂ فال میں بالکل بجا طور پر ان کا نام بھی نکل آیا ـــــ چنانچہ اب وہ انٹرنیشنل یونیورسٹی' اسلام آباد کے ریکٹر کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہیں ـــــ جبکہ راقم الحروف علامہ اقبال کے ان الفاظ کے مطابق کہ ع ''فقرِ قرآں اصل شاہنشاہی است!'' اور ع ''اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!'' ـــــ فرمان نبویؐ: ''اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ'' کے سائے میں سرمست ہے!'' ـــــ **فللّٰہ الحمد!!**

ڈاکٹر منظور صاحب نے حال ہی میں جو تحریر پاکستان کے تاریخی پس منظر' تحریک پاکستان کے عوامل' مسلم قومیت کے تصور ـــــ اور پھر پاکستان کے موجودہ معروضی حالات پر تبصرے کے ضمن میں سپردِ قلم فرمائی ہے ـــــ اور جو نوائے وقت ہی کے صفحات میں شائع ہوئی ہے' اس کے بعض پہلو تو متفق علیہ ہیں۔ مثلاً:

(i) یہ کہ پاکستان کا لفظ ''قدیم'' نہیں بلکہ ''حادث'' ہے' چنانچہ اس کی کوئی تاریخی شناخت نہ تھی۔ یہ بات میں نے خود بھی اب سے بائیس سال قبل اپنی تالیف ''استحکامِ پاکستان''

میں تحریر کی تھی کہ پاکستان کے نام کو کوئی ''تاریخی تقدس'' (Historical sanctity) حاصل نہیں تھی‘ اور اس پر مستزاد ہماری بدقسمتی کہ ہم اپنے کردار اور عمل سے اس نام کے لیے کوئی ''نیک نامی'' بھی نہ کما سکے ـــــ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے جب ہمیں ''علیحدگی'' کا صدمہ پہنچایا تو اس سے بھی بڑا صدمہ اس بات پر ہوا کہ انہوں نے اپنی پیشانی پر سے پاکستان کا لیبل اتار کر خلیج بنگال میں غرق کر دیا ـــــ اور اس نام کی دھیلے بھر کی قیمت (goodwill) بھی نہ سمجھتے ہوئے ع ''میں باز آیا محبت سے‘ اٹھا لو پاندان اپنا!'' والا انداز اختیار کر لیا ـــــ (جبکہ بیسویں صدی میں بہت سے ممالک طویل عرصے تک دو دو حصوں میں تقسیم رہے‘ لیکن کسی نے اپنا نام تبدیل نہیں کیا!)

(ii) میں نے اس کے علاوہ اپنی تالیف میں اس جغرافیائی عامل کا ذکر بھی کیا تھا کہ سلطنت خداداد پاکستان کی اپنے پیدائشی دشمن کے ساتھ کوئی قدرتی سرحد نہیں تھی‘ یعنی نہ کوئی سمندر حائل تھا نہ پہاڑ! ـــــ گویا جغرافیائی اعتبار سے یہ ایک خالص غیر فطری تقسیم تھی! چنانچہ تاریخی عامل کی طرح جغرافیائی عامل بھی ہمارا پشت پناہ نہیں بلکہ مخالف تھا!

(iii) مجھے ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ مسلم قومیت کا بھی as such کوئی تصور پہلے سے موجود نہیں تھا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہمیشہ سے قومیت کی اصل بنیاد یا نسل کی اساس پر ہوتی آئی ہے یا لسان کی‘ ـــــ جس پر ماضیٔ قریب میں ''وطنی قومیت'' کے تصور کا اضافہ ہوا! ـــــ مسلمانوں کے لیے قرآن وحدیث میں قوم کا لفظ کہیں نہیں آیا بلکہ یا تو اُمّت کی اصطلاح وارد ہوئی ہے جس کے معنی ہیں ایک ''ہم مقصد گروہ'' ـــــ یا پھر حزب اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ـــــ یعنی اللہ کی پارٹی۔ البتہ ہندوستان میں مسلم قومیت کا تصور ایک تاریخی تقاضے کے طور پر ابھرا۔ برعظیم پاک و ہند میں مسلم اور غیر مسلم ہزار سال سے زائد عرصے تک ساتھ ساتھ زندگی گزارتے رہے تھے‘ لیکن اس کی کیفیت وہی تھی جس کا نقشہ سورۃ الرحمٰن کی ان آیات میں کھینچا گیا ہے‘ کہ: ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿٢٠﴾﴾ یعنی دو روئیں متصلاً یعنی ساتھ ساتھ جاری رہیں لیکن ان کے مابین مغائرت کا ایک دبیز پردہ ہمیشہ حائل رہا‘ جس کے نتیجے میں ''من دیگرم تو دیگری!'' کی کیفیت برقرار رہی ـــــ تاہم اس ضمن میں جہاں تک معلوم ہے ''قومی تصادم'' کی اصطلاح کبھی استعمال نہیں ہوئی۔

اس صورت حال میں بنیادی تبدیلی ہند میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد پیدا ہوئی! انگریزوں نے ہندوستان کے اکثر و بیشتر علاقوں میں مسلمانوں سے حکومتیں چھینی تھیں، لہٰذا مسلمانوں میں ان کے خلاف نفرت اور عداوت کا جذبہ موجود تھا اور اُدھر حکومت کو بھی ان کی جانب سے بغاوت کا اندیشہ لاحق رہتا تھا ـــــ جس کے شواہد بھی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کے زمانے میں بھی علماء کرام نے پھانسیوں پر چڑھ کر اور ''کالے پانی'' کی سزا بھگت کر پیش کر دیے تھے! ـــــ جبکہ ہندوؤں کے لیے معاملہ صرف حکمرانوں یا آقاؤں کی تبدیلی (change of masters) کا تھا۔ چنانچہ غدر کے فوراً بعد انہوں نے انگریز کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت بلکہ تعاون و تعاضُد کی روش اختیار کر لی، جس کا مثبت ردّعمل انگریز حکومت کی جانب سے بھی ظاہر ہوا۔ اس سے شدید اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر یہ کیفیت برقرار رہی اور خاص طور پر اگر اسی حالت میں ہندوستان ایک سیاسی وحدت کی حیثیت سے آزاد ہو گیا تو مسلمان بحیثیتِ ''قوم'' نہ صرف یہ کہ مغلوب و محکوم بن کر رہ جائیں گے بلکہ اگر ہندوؤں کے انتہا پسند لوگوں کو عروج حاصل ہو گیا (جیسے آریہ سماج، ہندو مہا سبھا، آر ایس ایس، شیوسینا وغیرہ) تو شاید ہند میں بھی اسلام اور مسلمانوں کا وہی حشر ہو جو پانچ سو سال قبل اندلس میں ہو گیا تھا۔ (بعض لوگوں کے علم میں اگر پہلے نہیں تھا تو اب اس حوالے سے انہیں حیرت ہو گی کہ بعینہٖ یہی الفاظ قائداعظم نے ۱۷/اپریل ۱۹۴۶ء کو حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج میں مسلمان خواتین کے ایک اجلاس میں کہے تھے!) ـــــ اس صورت حال کا احساس سب سے پہلے سرسید احمد خان مرحوم کو ہوا جنہوں نے اس کیفیت کی گھمبیرتا سے مسلمانانِ ہند کو خبردار کرنے کی بھرپور کوشش کی ـــــ اور پھر ان کے نائبین نے ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم کر کے اس کے ضمن میں عملی جدوجہد کا آغاز کیا! ـــــ اور

(iv) اس سلسلے میں آخری بات یہ کہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۲۴ء تک تقریباً ربع صدی کے دوران میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کے دستوری اور قانونی حقوق کی حفاظت اور مستقبل کی ضمانت کی بات تو کی، لیکن اس پورے دور میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کسی اسلامی ریاست یا اسلامی حکومت کے قیام کا ذکر تک نہیں ملتا۔ بلکہ واقعتاً مسلم لیگ مسلمان عوام کی جماعت بھی نہیں تھی، بلکہ صرف اشرافیہ (Elite Class) کے ایک کلب یا ایسوسی ایشن کی حیثیت رکھتی تھی، اس کا کوئی قومی یا عوامی کردار بھی نہیں تھا! ـــــ چنانچہ اکبرالٰہ آبادی نے ''مسلم

قوم‘‘ کے تصور پر یہ پھبتی بھی چست کی تھی کہ ؎ ’’دیکھ آئے قوم سنتے تھے جسے۔ چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے!‘‘ ـــــ بہرحال مسلم لیگ کی یہ جملہ مساعی ہندوؤں کی تنگ نظری‘ ہٹ دھرمی‘ تمرّد‘ اور مسلمانانِ ہند کو نفرت اور حقارت کے ساتھ نظر انداز کرنے کی روش کے باعث ناکام ہوگئیں ـــــ چنانچہ محمد علی جناح نامی شخص جس کے مقدّر میں مستقبل میں مسلمانانِ ہند کا قائداعظم بننا لکھا تھا ـــــ اور جو ابتداءً کٹّر نیشنلسٹ تھا‘ چنانچہ وہ مسلم لیگ کی تأسیس کے وقت اس میں شامل ہوا نہ بعد میں مزید سات سال تک! اور ۱۹۱۳ء میں شامل ہوا بھی تو اس شان سے کہ کانگریس کی ممبر شپ بھی برقرار رکھی‘ اور جو تیس برس تک ہندو مسلم مفاہمت اور اتحاد کے لیے سرتوڑ کوششیں کرتا رہا تھا‘ بالآخر ہندوؤں کی روش سے مایوس ہوکر نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی سیاست سے بالکل کنارہ کش ہوگیا ـــــ بلکہ ہندوستان کی سرزمین کو خیرباد کہہ کر انگلستان میں جا آباد ہوا ـــــ اور وہاں اس نے ایس ایم اکرام مرحوم (آبِ کوثر‘ موجِ کوثر اور رودِ کوثر والے) سے یہ جملہ کہا کہ ’’ہندو ناقابل اصلاح ہیں‘‘ (Hindus are incorrigible) اور ادھر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ’’ان کے لیڈر (اشرافیہ کے طبقے کے افراد) اگر صبح مجھ سے کوئی بات کرتے ہیں تو شام تک انگریز حکمرانوں کو بھی مطلع کر دیتے ہیں‘ ایسے حالات میں میں مسلمانانِ ہند کی قیادت کیسے کرسکتا ہوں!‘‘

البتہ اس کے بعد آیا مسلم لیگ کی تاریخ کا وہ تاریخی موڑ اور ’فیصلہ کن مرحلہ‘ جس سے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ڈاکٹر منظور صاحب نے کس عقل اور منطق کی بنا پر صرفِ نظر یا غضِ بصر کیا ہے۔ یہ انقلاب آفریں مرحلہ تھا ۱۹۳۰ء کا آل انڈیا مسلم لیگ کا الٰہ آباد سیشن جس میں علامہ اقبال نے اپنا تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا۔ پتہ نہیں ڈاکٹر منظور صاحب کی نگاہ میں حضرت علامہ بھی فلسفی‘ مفکر‘ اور دانا و بینا ہستی کی حیثیت رکھتے ہیں یا نہیں! جن کے بارے میں دنیا مانتی ہے کہ نہ صرف عظیم فلسفی اور وقت کے عظیم ترین مسلم مفکر تھے بلکہ عظیم "seer" بھی تھے‘ چنانچہ ایک جانب ان کی ’’نگاہِ تیز‘‘ نے مستقبل کے پردوں میں مستور سلطنتِ خداداد پاکستان کی جھلک دیکھ لی تھی‘ اور دوسری جانب ان کی ’’نگاہِ پردہ سوز‘‘ نے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی اس حقیقت کو دیکھ لیا کہ ع ’’فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!‘‘ ـــــ بہرحال اگر سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو اور عین اس وقت بھی کوئی شخص اس کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے تو اس میں سورج کا تو کوئی قصور نہیں۔ البتہ ایسے شخص کا معاملہ لاعلاج ضرور قرار پائے گا!

حضرت علامہ نے اپنے اس تاریخ ساز خطبے میں ـــــ

(i) اولاً فلسفے اور عمرانیات کے مسلّمہ اصولوں کی رُو سے ثابت کیا کہ مسلمانانِ ہند ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں ـــــ اور ''قوم'' کی کسی بھی ''تعریف'' پر کاملتاً پورا اترتے ہیں! ـــــ اور وہ کسی بھی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم نہیں ہو سکتے! بقول ان کے: ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!

اور خاص طور پر وطنی قومیت کا تصور تو مسلمانوں کے اجتماعی تحت الشعور سے کوئی مطابقت رکھتا ہی نہیں!

(ii) ثانیاً انہوں نے پیش گوئی کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک مسلم ریاست قائم ہوگی، اور اس کے ضمن میں انہوں نے ''تقدیر مبرم'' (Destiny) کا لفظ استعمال کیا ـــــ اور

(iii) ان دونوں باتوں سے بڑھ کر انہوں نے تحریکِ مسلم لیگ میں ایک نظریاتی (Ideological) انجکشن یہ کہہ کر لگایا کہ اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں موقع مل جائے گا کہ ہم اسلام کے روئے انور پر جو بدنما داغ اور دھبے عرب ملوکیت (Arab Imperialism) کے دوران لگ گئے تھے انہیں صاف کر کے اسلام کا اصل چہرۂ روشن دنیا کے سامنے لاسکیں (گویا دورِ بنو اُمیّہ اور دَورِ بنو عباس سے قبل کا نظام ـــــ یعنی نظامِ خلافتِ راشدہ دوبارہ قائم کر دیں!) ـــــ اور یہ آخری بات وہ تھی جس نے مسلم لیگ کی نیم مردہ رگوں میں انقلابی خون دوڑا دیا۔ پھر یہی انجکشن حضرت علامہ نے ۱۹۳۲ء میں لندن میں تیسری گول میز کانفرنس کے موقع پر محمد علی جناح کے ذہن و فکر میں لگایا، اور اس کی اساس پر انہیں دعوت دی کہ وہ واپس ہندوستان آ کر مسلمانوں کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالیں۔ چنانچہ جب محمد علی جناح نے ہندوستان واپس آ کر مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی اور نہ صرف مسلم قومیت کا راگ الاپا ـــــ بلکہ اسلام کی ''قوّالی'' گائی، تو چونکہ یہ مسلمان عوام کے دلوں کی آواز تھی لہٰذا وہ مسلمانوں کے ''قائداعظم'' قرار پائے، اور مسلمانوں کے جذبات میں اتنی شدتِ وحدت پیدا ہوئی کہ برعظیم پاک و ہند کی پوری مسلمان قوم ''وجد'' میں آ گئی اور اسے ''حال'' آ گیا ـــــ چنانچہ یہ اسی ''حال'' کا مظہر ہے کہ اقلیتی صوبوں کے

مسلمانوں کی اکثریت نے بھی ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کو ووٹ دیے جس سے پاکستان کے قیام کا راستہ ہموار ہوا۔ گویا پاکستان اپنے قیام کے لیے اصلاً ممنون ہے علامہ اقبال کا' جو اس کے مفکر و مصور ہی نہیں مجوز و مبشر بھی تھے' اور ان ہی کے تجویز کردہ راستے پر قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں قیامِ پاکستان کے لیے عوامی تحریک چلی' اور میں واقعۃً حیرت کا شکار ہوں اس پر کہ' ڈاکٹر منظور احمد صاحب جیسے دانا و بینا انسان کی نظروں سے یہ پہاڑ ایسی حقیقت کیسے اوجھل رہ گئی اور ڈاکٹر صاحب کے وسیع و عریض ''دائرۂ بصارت'' (Field of vision) میں علامہ اقبال کی شخصیت اور ۱۹۳۰ء کا اجلاس الٰہ آباد اور اس میں حضرت علامہ کا خطبہ ایک ''BLIND SPOT'' کیسے بن کر رہ گیا!!!

اس سلسلے میں اس سوال کا جواب بھی ہمارے ''لبرل'' اور ''روشن خیال'' دانشوروں کے ذمّے ہے کہ آخر اگر مسئلہ صرف قومی ہوتا اور مسلمانانِ ہند کو صرف دنیاوی بہبود مطلوب ہوتی تو تقسیم ہند کی تجویز کی صورت میں بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کا پاکستان کے حق میں ووٹ دینا کون سی عقل و منطق کی بات تھی؟ ـــــ عقل و منطق اور ''روشن خیالی'' کی رو سے تو یہ چیز نری حماقت اور عین پاگل پن کا مظہر نظر آتی ہے! ـــــ لیکن کیا کیا جائے کہ چمگادڑوں کو دن کی روشنی میں کچھ نظر نہیں آتا ـــــ چنانچہ ہمارے بعض دانشور اور خصوصاً اخباری کالم نگار پوری ڈھٹائی کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''نظریۂ پاکستان'' نام کی کسی شے کا کبھی وجود ہی نہیں تھا ـــــ یہ تو پاکستان میں ایک خاص آمریت کے دور میں ایک فوجی جنرل کی گھڑی ہوئی اصطلاح تھی!) ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون! یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک دانشور نے فرمایا کہ قرآن میں مطلق شراب نوشی کی حرمت وارد نہیں ہوئی (صرف شراب پی کر مدہوش ہو جانا ممنوع ہے!) اس لیے کہ قرآن میں کہیں شراب کے لیے ''حرام'' کا لفظ نہیں آیا۔ گویا ان کے نزدیک ﴿رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ﴾ کے الفاظ اور ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ کی تہدید کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ **فیاللعجب!**

اب اگر کوئی اور ''ڈھیٹ تر'' انسان یہ کہہ دے ـــــ جیسا کہ ذرا خفی اور ملفوف الفاظ میں ڈاکٹر منظور صاحب نے کہا بھی ہے کہ مسلم قومیت کا یہ ''راگ'' اور اسلامی نظام کی یہ ''قوّالی'' تو صرف ایک سیاسی ضرورت یا حربہ تھی تو ظاہر ہے کہ یہ بات کہنے والے کی نہ تو زبان پکڑی جا سکتی ہے' نہ قلم روکا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی شخص قائداعظم محمد علی جناح کو بھی

اسی قبیل کا ''سیاست کار'' سمجھے جیسے کہ موجودہ صدر پاکستان آصف زرداری صاحب ہیں' تو اس کی بھی زبان تو گدّی سے نہیں کھینچی جاسکتی' تاہم ع ''جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے' باغ تو سارا جانے ہے!'' کے مصداق ایسے نام نہاد دانشور جو چاہیں کہیں لیکن پوری دنیا گواہ ہے کہ محمد علی جناح نامی شخص ایک نہایت راست باز اور راست گو (straight forward) انسان تھا جس کے ظاہر و باطن میں ہرگز کوئی فرق نہیں ہوتا تھا ـــــ اور جو صرف وہی بات زبان سے نکالتا تھا جسے وہ دل و دماغ اور ذہن و قلب کے متفقہ فیصلے کے مطابق صحیح سمجھتا تھا! چنانچہ یہ بات کہ قائد اعظم اپنی بات کے پکے اور عہد کے سچّے نہ تھے کوئی ایسا شخص ہی کہہ سکتا ہے کہ جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھ گئی ہو ـــــ!

ہاں! یہ ضرور ہے کہ جب اقبال اور جناح' اسلامی نظام کی بات کرتے تھے تو ان کا زیادہ زور (emphasis) اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی جانب ہوتا تھا' یعنی سیاسی' معاشی اور معاشرتی جملہ سطحوں پر عدل و قسط کا وہ نظام جو اسلام نے عطا فرمایا ہے' جبکہ اُن کی اسلام کی ''قوّالی'' سے متاثر ہو کر جن علماء و مشائخ نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا ان کے اور عام مسلمانوں کی بھی عظیم اکثریت کے نزدیک اسلامی نظام کے قیام سے مراد زیادہ تر شریعتِ اسلامی' اور خاص طور پر اس کے نظامِ حدود و تعزیرات کا نفاذ تھا ـــــ لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی تضاد نہیں ہے' معاملہ صرف تاکید (emphasis) اور اوّلیت اور ثانویت کے فرق کا ہے' ورنہ یہ دونوں چیزیں آپس میں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں ـــــ اور کسی بھی نظام کو قائم رکھنے اور سپورٹ کرنے کے لیے اس سے مناسبت رکھنے والے قوانین کا نفاذ لازمی ہوتا ہے!ـــــ چنانچہ اگر قائداعظم کی گیارہ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر کے ایک جملے سے کسی قدر غلط فہمی پیدا ہوئی بھی تھی تو اس کی نفی اور تردید کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے ۲۵/ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے اجلاس میں یہ کہہ کر کر دی تھی ''نہ معلوم کچھ شرپسند لوگ کیوں یہ خیال پھیلا رہے ہیں کہ پاکستان کا دستور و قانون شریعت اسلامی کے مطابق نہیں ہوں گے''ـــــ! (شائع شدہ ''ڈان'' بابت ۲۶/ جنوری ۱۹۴۸ء) کیا اس کے بعد بھی کوئی مزید ثبوت درکار ہے کہ قائداعظم کا نعرۂ اسلام مبنی بر خلوص و اخلاص تھا اور سراسر صداقت کا حامل تھا اور اس میں ایک فی صد بھی کھوٹ شامل نہیں تھا!

(۲)

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ـــــ

(i) مسلم لیگ کی تأسیس اور اس کے بعد اس کی زندگی کے پہلے چوبیس سال کے دوران میں اس کا جذبۂ محرکہ صرف ہندو کا خوف تھا' جسے اگر کوئی ''منفی'' محرک قرار دے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن ـــــ

(ii) جو شخص اُس تبدیلی کو نظر انداز کر دے جو ۱۹۳۰ء کے اجلاس میں مسلم لیگ اور اس میں پیش شدہ خطبۂ اقبال کے نتیجے میں آئی تھی ـــــ تو وہ یا تو کلر بلائنڈ (colour blind) ہے یا تجاہل عارفانہ سے کام لیتا ہے۔ اس اجلاس سے جس ''مثبت'' جذبے کا انجکشن جسدِ مسلم لیگ میں لگا تھا' بعد کی پوری عوامی تحریک اسی کی مرہونِ منت ہے ـــــ اس لیے کہ بجلی کی منفی اور مثبت تاروں میں جب کسی سوِچ (switch) کو آن کر دینے سے ربط قائم ہو جاتا ہے تو پھر یکدم کرنٹ دوڑنے لگتا ہے جو کہیں بلب اور ٹیوب لائٹس کو روشن کر دیتا ہے اور کہیں کسی مشین کو حرکت میں لے آتا ہے ـــــ چنانچہ بعینہٖ یہی معاملہ ۱۹۳۰ء کے بعد تحریکِ مسلم لیگ کا ہوا ـــــ اور ''جذبہ'' چونکہ اندھا ہوتا ہے' چنانچہ جبران خلیل کا مشہور قول ہے کہ ''عقل سے روشنی حاصل کرو اور جذبہ کے تحت حرکت کرو!'' لہٰذا مسلمانانِ ہند نے عقل کی روشنی تو عظیم فلسفی اور مفکر علامہ اقبال سے لی۔ لیکن پھر ''عقل کو محوِ تماشائے لب بام'' چھوڑ کر خالص جذبات کے تحت اپنی عملی تحریک کو آگے بڑھایا۔ چنانچہ اس جذباتی فضا میں بہت سے تاریخی حقائق بھی نظر انداز ہوئے' بہت سے پہاڑ ایسے جغرافیائی عوامل بھی پاؤں تلے روندے گئے' اور یہ سوال بھی نظر انداز کر دیا گیا تھا کہ بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا۔

بہر حال' اُس وقت جو جوش اور خروش اسلامیانِ ہند میں پیدا ہو گیا تھا اسے اگر ''اسلامی رومانویت'' سے تعبیر کیا جائے' جیسے کہ بہت سے روشن خیال مفکرین کرتے ہیں اور خود ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے بھی کیا ہے ـــــ تو اس پر بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس لیے کہ اُس وقت کے معروضی حالات میں اور جس نہج کی ایک خالص قومی تحریک مسلم لیگ چلا رہی تھی اس کے نتیجے میں ایک اسلامی ریاست کا وجود میں آ جانا واقعتاً ع ''ایں خیال است و محال

است وجنوں!'' کا مصداقِ کامل تھا۔ چنانچہ جو خطبہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے قراردادِ پاکستان کے منظور ہونے کے کچھ دنوں بعد اسٹریچی ہال، علی گڑھ یونیورسٹی میں ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے'' کے عنوان سے دیا تھا وہ بالکل صحیح تھا اور مجھے آج لگ بھگ ستر برس گزر جانے کے بعد بھی اس کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے!

لیکن مولانا مودودی نے تو یہ خطبہ ۱۹۴۰ء میں دیا تھا، جبکہ اس امر کے قوی شواہد موجود ہیں کہ خود ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد کے مصنف کے ذہن میں بھی یہ بات موجود تھی کہ ایک ایسی خالص قومی تحریک کے ذریعے اسلامی نظام ہرگز قائم نہیں ہوسکتا جس میں ہر شخص صرف اس بنیاد پر صرف شریک ہی نہ ہوسکتا ہو بلکہ مقامی، ضلعی یا صوبائی قیادت میں بھی شامل ہوسکتا ہو کہ ع ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!'' کے مصداق اس کا نام مسلمانوں کا سا ہو۔ قطع نظر اس سے کہ اس کے اصل عقائد کیا ہیں، وہ اسلام کے شعائر کا پابند ہے یا نہیں —— بلکہ خواہ عملاً پرلے درجے کا فاسق و فاجر ہو —— چنانچہ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ۱۹۳۰ء کے خطبے کے فوراً بعد جہاں جسدِ مسلم لیگ میں ایک حیاتِ تازہ کا کرنٹ دوڑا، وہاں اسی خطبے کے نتیجے میں علی گڑھ میں ان ہی دانشوروں کے ذریعے جن کا حوالہ ڈاکٹر منظور صاحب نے دیا ہے ایک ''جماعت مجاہدین علی گڑھ'' بھی قائم ہوئی تھی، جس کے روح رواں تو دو سینئر پروفیسر تھے، یعنی ڈاکٹر ظفر الحسن (صدر شعبہ فلسفہ) اور ڈاکٹر عبدالجبار خیری، اور کچھ ان کے نوجوان طلبہ تھے، جیسے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور ڈاکٹر ایم ایم احمد۔ پھر ان حضرات نے علامہ اقبال سے رجوع کیا۔ اور طویل سلسلہ جنبانی کے بعد طے ہوا کہ ایک ''جمعیتِ شُبّان المسلمین'' قائم کی جائے جو ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر کام کرے —— چنانچہ: ——

(i) اس میں صرف وہ مسلمان شامل کیے جائیں جو شریعت کے پابند ہوں، ——

(ii) اس کی امارت کی اساس اسلام کے اصولِ ''بیعت'' پر ہو ——

(iii) وہ کبھی الیکشن میں حصہ نہیں لے گی بلکہ صرف دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کے ذریعے ایک جانب ذہنی و فکری —— اور دوسری جانب عملی و اخلاقی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرے گی! —— وقِسّ علٰی ذٰلك!!

لیکن یہ سب کچھ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ہو رہا تھا جب ایک طرف حضرت علامہ کی علالت زور پکڑ چکی تھی، اور دوسری جانب انگریزی حکومت ان کے بعض قریبی ''ساتھیوں'' کے ذریعے

ان کا ''محاصرہ'' کر چکی تھی' لہٰذا یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ (راقم الحروف بہت ممنون ہے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم کا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے بالکل آخری ایام میں اپنی شدید علالت اور ضعیفی کے باوجود یہ ساری تفصیلات اپنی تالیف: ''علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین'' میں درج کر دی تھیں' جسے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم و مغفور کے رفیق کار چودھری مظفر حسین مرحوم نے ''آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس'' کی جانب سے شائع کیا تھا. لیکن افسوس کہ چودھری صاحب کے انتقال کے بعد وہ کانگریس توسنِ ''آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!'' کی مصداق بن گئی۔ تاہم اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے اس کا ایک خلاصہ ''علامہ اقبال کی آخری خواہش'' کے نام سے طبع کر دیا تھا جو دستیاب ہے!) ـــــ بہرحال یہ امر علامہ اقبال کی شخصیت میں تصور یا نظریہ پسندی (Idealism) اور واقعیت یا حقیقت پسندی (Realism) کے متضاد پہلوؤں کے امتزاج اور جامعیت کا مظہر ہے کہ ایک جانب وہ خطبہ الٰہ آباد کے بعد اپنے مزاج اور اپنی اُفتادِ طبع کے بالکل برعکس عملی سیاست کے میدان میں بھی سرگرم رہے ـــــ اور اس ضمن میں قائداعظم کے ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے. اور دوسری طرف ایک ٹھیٹھ نظریاتی اسلامی جماعت کی تأسیس کے لیے بھی فکرمند اور کوشاں رہے!

یہاں ایک نکتہ پر مزید گفتگو ہو جائے تو اچھا ہے ـــــ ہندوستان کے اُس وقت کے معروضی حالات میں دس کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کا معاملہ شدید تشویش ناک صورت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ ایک طرف ہندو مذہب اور تہذیب کے احیاء' ہندوؤں میں مسلمانوں سے ''ہزار سالہ غلامی'' کا انتقام لینے کا جذبہ ـــــ اور فی الجملہ ہندو امپیریلزم کا خوفناک عفریت مسلمانوں کی جانب جارحانہ انداز میں بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف' دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریز ہندوستان سے اپنا بستر گول کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اس معاملے میں شدید عجلت پسندی کا مظاہرہ کر رہا تھا ـــــ چنانچہ یہ وقت صرف اصولی دعوت و تبلیغ اور اخلاقی و عملی اصلاح کا نہیں تھا (جیسے کہ مولانا مودودی کہہ رہے تھے!) بلکہ بھارت کے دس کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کے مستقل تسلط اور غلامی کے خطرے سے نجات دلانے کا تھا ـــــ انبیاء و رسل کی تاریخ میں اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے ـــــ قرآن مجید میں سورۃ المائدۃ میں پہلے حضراتِ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور پھر نبی اکرم ﷺ کے ذکر کے بعد فرمایا گیا: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ (آیت ۴۸) ـــــ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت مقرر کی ہے

اور ایک ''منہاج''، یعنی لائحہ عمل! ـــــ چنانچہ موسویؑ منہاج میں اوّلین ترجیح ایک مسلمان قوم بنی اسرائیل کو آلِ فرعون کی بدترین غلامی سے نجات دلانا تھا ـــــ یہی وجہ ہے کہ فرعون کے دربار میں اپنی پہلی حاضری ہی پر آنجنابؑ نے مطالبہ کر دیا تھا کہ: ﴿فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۬ؕ وَلَا تُعَذِّبۡهُمۡ!﴾ (طٰہٰ:۴۷) ـــــ اور پھر اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے مابین جو شدید کشاکش جاری رہی اس میں بنی اسرائیل کی دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت کا موقع ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نَو معجزات کا تو مصر ہی میں مشاہدہ کر لیا تھا ـــــ اور پھر وہاں سے خروج کے بعد قدم قدم پر ایک سے ایک بڑھ کر معجزے دیکھے ـــــ وہ اپنے لیے بت تراشنے کا مطالبہ بھی کرتے نظر آتے ہیں، بلکہ پھر حضرت موسیٰؑ کے کوہ طور پر جانے کے بعد ان کی بڑی تعداد گوسالہ پرستی میں بالفعل ملوث ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر جب جنگ کا حکم ملتا ہے تو چھ لاکھ کے مجمع میں سے (یہ تعداد تورات کی کتاب الخروج میں درج ہے) صرف دو اشخاص نکلے، باقی سب نے کورا جواب دے دیا ـــــ الغرض! آل انڈیا مسلم لیگ علامہ اقبال کی فکری قیادت اور قائداعظم کی عملی رہنمائی میں اسی منہاجِ موسویؑ پر عمل کر رہی تھی! جس کے نتیجے میں بحمد اللہ مسلمانانِ ہند کی دو تہائی تعداد ہندو کی غلامی کے خطرے سے نجات پا گئی۔ اور بقیہ ایک تہائی نے گویا یہ قربانی دی کہ ہم پر جو بیتے گی ہم سہہ لیں گے، آپ لوگ پورے عالمِ انسانیت کو اسلام کی ہدایت دینے یا ان پر کم از کم اتمامِ حجت کرنے کے لیے دوبارہ دنیا میں خلافتِ راشدہ کا نمونہ قائم کر دیں! یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اس کے بالکل برعکس معاملہ تھا منہاجِ عیسویؑ کا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی ایک حرف بھی رومیوں کے تسلط و اقتدار کے خلاف نہیں کہا، بلکہ پوری توجہ یہودیوں میں صرف موروثی ''عقائد'' کی بجائے حقیقی ایمان کی آبیاری اور خالص رسم پرستانہ مذہبیت کی بجائے بنیادی انسانی اخلاقیات اور شریعت کی بھی باطنی روحانی کیفیات کی ترویج پر مرکوز رکھی۔ البتہ جامع ترین ''منہاج'' محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا تھا کہ آپؐ نے اوّلاً دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں کچھ لوگوں کو جمع کیا، پھر ان کی تربیت اور تزکیہ کے مراحل طے کیے اور پھر انہیں ''بیعتِ سمع و طاعت'' کے ذریعے ایک مضبوط ڈسپلن میں منسلک کر کے ایک انقلابی جماعت ''حزب اللہ'' کی شکل دے دی ـــــ اور پھر جب وہ معتد بہ تعداد کو پہنچ گئی تو اسے طاغوت اور اس کے غلبہ و اقتدار کے علمبرداروں سے ٹکرا دیا ـــــ بقولِ اقبال: ؎

''با نشّۂ درویشی در ساز و دمادم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!''

اوراس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ مولانا مودودی نے اوّلاً ۱۹۳۸ تا ۱۹۴۰ء اپنی تحریروں کے ذریعے اقبال کے اس شعر کے مصرعہ اوّل کے مطابق ''جماعتِ اسلامی'' کے نام سے ''حزب اللہ'' کے قیام کی دعوت دی' چنانچہ اس کے ضمن میں ان کی پہلی تالیف کا نام ''ایک صالح جماعت کی ضرورت'' تھا ـــــ پھرانہوں نے ۱۹۴۱ء میں بالفعل ان خطوط پر جماعت اسلامی قائم کر دی' (البتہ اقبال کے شعر کے مصرعہ ثانی کے ضمن میں کوئی واضح نقشہ ان کے ذہن میں موجود نہیں تھا' جس کی بنا پر وہ بعد میں ایک ٹھوکر کھا گئے' جس کا ذکر بعد میں آئے گا!)

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کے ایک اور اعتراض کا جواب بھی متذکرہ بالا بحث میں موجود ہے' یعنی یہ کہ مسلم لیگ کے ''رومانوی'' دور میں کبھی واضح نہیں کیا گیا کہ مجوزہ ملک (پاکستان) میں اسلامی نظام کا قیام اور شریعت اسلامی کے نفاذ کا طریق کار کیا ہوگا' اور اس کے تفصیلی خدوخال کیا ہوں گے؟ـــــ یہ بات تھوڑے سے غور وفکر سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اُس دَور میں اِس پنڈورا بکس کو کھول دینا مقصد کے منافی (counter productive) ہوتا' اور واقعہ یہ ہے کہ یہ قائداعظم کی نہایت دانش مندی تھی کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس بحث کا دروازہ بند رکھا بلکہ خود اپنی ذات کو بھی ہر قسم کی مذہبی فرقہ واریت سے بالاتر رکھا!! لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی نقشہ موجود ہی نہیں تھا۔ دراصل ان جملہ امور میں وہ علامہ اقبال کے پیروکار تھے ـــ جنہیں انہوں نے عین علامہ اقبال کی وفات کے دن یعنی ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتہ میں ہونے والے عظیم الشان جلسہ عام میں ''بلاشبہ پوری نسلِ انسانی کے عظیم ترین شعراء' فلسفیوں اور مستقبل کے پردوں میں مستور حقائق وحوادث کو دیکھ لینے والے لوگوں میں سے ایک''.....اور خود اپنے لیے ''ایک ذاتی دوست' فلسفی اور رہنما ہی نہیں بلکہ جذبے کا منبع' اور روحانی سہارا'' قرار دیا تھا (مطبوعہ سٹار آف انڈیا بابت ۲۲/اپریل ۳۸ء)۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے ۱۹۴۰ء میں ''اقبال ڈے'' کی ایک تقریب میں فرمایا تھا کہ ''اگر میں ہندوستان میں ایک مسلم ریاست کے قیام تک زندہ رہا' اور اس وقت مجھے اس انتخاب کا موقع دیا گیا کہ میں اپنے لیے اس ریاست کی حکمرانی اور تصانیف اقبال میں سے کسی ایک کو چن لوں تو میں اقبال کی تصانیف کو ترجیح دوں گا'' ـــــ چنانچہ خواہ ان کے بعض مذہبی

مزاج کے ساتھیوں اور پیروکاروں کا یہ خیال رہا ہو ـــــ ان کا تصور ہرگز یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ بس قیامِ پاکستان کے بعد پہلے ہی روز پاکستان میں صدیوں پہلے مرتب ہونے' اور امتدادِ زمانہ کے باعث جامد اور متحجّر ہوجانے والی فقہوں میں سے کسی ایک کو سلطنت کا دستور و قانون قرار دے کر شیخ الاسلام اور قاضی القضاۃ جیسے عہدے قائم کر دیے جائیں گے ـــــ جبکہ ان کے ''پیر و مرشد'' علامہ اقبال اپنے شہرۂ آفاق خطبات میں یہ کہہ چکے تھے کہ عہد حاضر کا ری پبلکن نظامِ سیاست و ریاست اسلام کے مزاج سے بہت قریب اور مناسبت رکھتا ہے' اور وقت آ گیا ہے کہ ہم اجتہاد کے جو دروازے صدیوں سے مقفل چلے آ رہے ہیں' انہیں کھولیں ـــــ اور فقہ اسلامی کی تدوینِ نو کریں ـــــ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قائداعظم مستقبل کی اسلامی ریاست کے قیام کے ضمن میں اپنا حصہ (contribution) صرف یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے بفضل خداوندی اور ان کے الفاظ میں ''بہ فیضِ محمدیؐ'' اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی غیر مسلموں کی عظیم اکثریت کی چٹان کو راستے سے ہٹا دیا ہے' ـــــ اب اس نوزائیدہ ملک میں ''خلافتِ راشدہ'' کا نظام بالفعل قائم کرنا یہاں کے مسلمانوں کا کام ہے ـــــ اس سلسلے میں حضرت قائد اعظم کے نہ صرف وہ الفاظ نہایت اہم اور چشم کشا ہیں جو انہوں نے اپنی حیاتِ دُنیوی کے بالکل آخری لمحات میں اپنے معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ مرحوم (پروفیسر امراضِ تپ دق) سے کہے تھے' بلکہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس گفتگو کا جو واقعاتی پس منظر بیان کیا ہے اس کا بھی ایک ایک حرف اس قابل ہے کہ ہر پاکستانی مسلمان کے حافظے میں محفوظ رہے ـــــ وہ پورا واقعہ اور اس میں قائداعظم کے فرمودات یوں ہیں:

> ''میرے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ لاہور سے زیارت تک کا سفر طے کر کے میں شدید بیماری میں مبتلا قائداعظم کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے باوجود کہ بانیٔ پاکستان انتہائی کمزور ہو چکے تھے اور ان کا جسم کمبل میں لپٹا ہوا تھا' انہوں نے اپنا ہاتھ باہر نکالتے ہوئے مجھ سے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پوچھا ''آپ کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' مرض الموت میں مبتلا اس عظیم انسان کے اخلاق' تواضع اور انکساری کی یہ اچھوتی مثال تھی' حالانکہ مجھ سے ہاتھ ملانے اور مزاج پرسی کرنے ہی سے وہ ہانپنے لگے اور بعد میں کئی منٹ تک آنکھیں بند کیے لیٹے رہے۔
>
> برصغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد وطن سے روشناس کرانے والے قائداعظم کا خدا پر ایمان اور اصولوں پر یقین ہمارے لیے خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ قائداعظم

بظاہر ان معنوں میں مذہبی رہنما نہ تھے جن معنوں میں عام طور پر ہم مذہبی رہنماؤں کو لیتے ہیں‘ لیکن مذہب پر اُن کا یقین کامل تھا۔ ایک بار دوا کے اثرات دیکھنے کے لیے ہم ان کے پاس بیٹھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں‘ لیکن ہم نے بات چیت سے منع کر رکھا تھا‘ اس لیے الفاظ لبوں پر آ کر رک جاتے تھے۔ اس ذہنی کشمکش سے نجات دلانے کے لیے ہم نے خود انہیں دعوت دی تو وہ بولے:

’’تم جانتے ہو‘ جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے! یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ رسولِ خدا ﷺ کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافتِ راشدہ کا نمونہ بنائیں‘ تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے‘‘۔

(شائع شدہ روزنامہ جنگ بابت ۱۱/ ستمبر ۱۹۸۸ء)

ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے بہت سے سیکولر مزاج (یا ’’روشن خیال‘‘) دانشور شاید اس تحریر کو جعلی قرار دیں (جیسا کہ ایک ٹیلی ویژن مذاکرے میں ایک ریٹائرڈ جرنیل اور مشرف دور کے مرکزی وزیر داخلہ‘ اور گورنر سندھ نے کہا بھی تھا!) لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ نہ تو ڈاکٹر ریاض علی شاہ مرحوم (جو میرے اساتذہ میں سے تھے) کوئی مذہبی آدمی تھے‘ ـــــ نہ ان کے پیش نظر مذہب کی بنیاد پر سیاست میں حصہ لینا تھا! ـــــ تو آخر اس جعل سازی کا کیا محرّک ہو سکتا ہے؟

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد یہاں کے مسلمانوں کا کوئی کام تھا کہ اوّلاً عوامی مطالبے کے ذریعے ملک کے بننے والے دستور میں یہ امور طے کراتے کہ اس ملک میں حاکمیت اللہ کی ہے‘ ـــــ اور یہ کہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنّت کو یہاں ہر معاملے میں مطلق بالادستی حاصل ہوگی ـــــ پھر مذہبی شخصیات‘ ادارے اور جماعتیں پریشر گروپس کے انداز میں دباؤ ڈالتے ہوئے یہاں ملکی دستور کے مطابق قائم شدہ قانون ساز اداروں کے ذریعے مناسب اجتہادات کے ساتھ قوانینِ شریعت کی تدوینِ نو اور ان کی تدریجی تنفیذ کے مراحل طے کراتے رہتے!

چنانچہ بحمداللہ اس عمل کا آغاز بھی بالکل صحیح انداز میں ہوگیا تھا ـــــ اور وہ اس طرح کہ سب سے پہلے مولانا مودودی مرحوم نے اپریل ۱۹۴۹ء میں لاہور کے ایک جلسۂ عام میں ''مطالبۂ نظامِ اسلامی'' کے عنوان سے تقریر کی ـــــ اور پھر چند نکات پر مشتمل ایک ''مطالبہ'' مرتب کر کے اس کی بڑی پیمانے پر تشہیر کی گئی' اور پھر ایک عظیم مہم کے ذریعے خطوط اور ٹیلی گراموں کے ذریعے یہ مطالبہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو بھجوایا گیا ـــــ اور چونکہ اُس وقت تک جماعت اسلامی معروف معنی میں سیاسی جماعت نہیں تھی' لہٰذا تمام دینی و مذہبی حلقوں کی طرف سے بھی اس کی بھرپور تائید ہوئی اور مسلم لیگ کے بھی مذہبی مزاج کے حامل لوگوں نے بھرپور تعاون کیا۔ چنانچہ روزانہ خطوط اور ٹیلی گراموں کے بھرے ہوئے تھیلے اسمبلی کے سپیکر کی میز پر رکھے جانے لگے۔ پھر چونکہ دستور ساز اسمبلی میں جماعت اسلامی کی تو کوئی نمائندگی تھی ہی نہیں لہٰذا وہاں ان ہی مسلم لیگی حضرات نے ساتھ دیا ـــــ اور خاص طور پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے کلیدی کردار ادا کیا ـــــ جس کے نتیجے میں مارچ ۱۹۴۹ء میں ''قراردادِ مقاصد'' پاس ہوگئی! ـــــ گویا خلافتِ راشدہ کی بنیاد کی پہلی دستوری اینٹ رکھ دی گئی! جس کے نتیجے میں ایک طرف ؎ ''نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد ــ اور ــ حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد!'' کے مصداق دنیا بھر کے سیکولر ایوانوں میں بھی سراسیمگی پیدا ہوگئی کہ ع ''اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!'' اور دوسری جانب خود پاکستان میں بھی سیکولر مزاج لوگوں نے دہائی دینی شروع کر دی کہ یہاں کس کا اسلام نافذ ہوگا؟ ـــــ شیعہ کا یا سنّی کا؟ ـــــ حنفی کا یا وہابی کا؟ ـــــ دیوبندی کا یا بریلوی کا؟ ـــــ جس کا منہ توڑ جواب پاکستان بھر کے تمام مذہبی فرقوں اور دینی جماعتوں کے سربراہوں پر مشتمل ۳۱ علماء نے دستور سازی کے ۲۲ بنیادی اصولوں پر مہر اتفاق ثبت کر کے دے دیا کہ ان کی اساس پر پاکستان کا مفصل دستور ترتیب دیا جائے! ـــــ گویا اقبال اور قائداعظم کے تصورات کے مطابق دستوری و قانونی سفر کا صحیح نہج پر آغاز ہوگیا! ـــــ

(جاری ہے)

قرآن حکیم کے چار نمایاں اوصاف

عتیق الرحمٰن صدیقی

اللہ تعالیٰ نے کتابِ حکیم کی سورۂ یونس میں کلامِ مبین کے چار نمایاں اوصاف بیان فرمائے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾

''لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے' اور یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔ (اے نبیؐ) کہو کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی ہے' پس اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے۔ یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں۔''

قرآنِ مبین کے خصائص بے شمار ہیں' ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ یہ ایسا معجز نما کلام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد کریم ﷺ پر اتارا ہے' لاکھوں کروڑوں کتابوں سے الگ ایک امتیازی شان کا حامل ہے' ایک ایسی اعلیٰ ترین نگارش جو ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ یہ مرقع علم و ہدایت اور حق و باطل کی فرقان ہے۔ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾﴾ (الطارق) ''یہ ایک جچی تلی بات ہے''۔ یہ بات کو نکھارنے والا کلام ہے۔ ایسے جداگانہ اور نرالے اسلوب کا حامل دل نشیں و دل آویز کلام ہے جو دل و دماغ کی کایا پلٹ دینے والا ہے۔ ایسی مقناطیسیت سے معمور ہے جو دلوں کو کھینچتا بھی ہے اور اپنی حلاوت اور مٹھاس سے اس کے تاروں کو جوڑتا بھی ہے۔ یہ قلب و نظر کو توانائی اور روح کو طراوت بخشتا ہے۔ بندوں کو نہ صرف اپنے ربّ کے قرب کی لذتوں سے آشنا کرتا ہے بلکہ ایک عظیم نصب العین کے گرد انہیں مجتمع بھی

کرتا ہے۔ ایک بے مثل اور بے نظیر کلام ہے جس کی مثال لانا ممکن نہیں۔ اس دلکشا' عطر بیز کتابِ انقلاب کے حیات آفریں اثرات کا ادراک کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

''(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!''

''محسن انسانیت'' کے مؤلف مولانا نعیم صدیقی کے الفاظ میں:

''قرآن دنیا کی بہترین ادبی کتاب ہے۔ قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ رُلا دینے والی' خوف طاری کر دینے والی' عزم و یقین ابھارنے والی' جوش میں لانے والی' حیرت میں ڈال دینے والی' مبہوت کر دینے والی' اطمینان دلانے والی' جوش میں لانے والی' آمادۂ پیکار کر دینے والی اور ایثار کی سپرٹ پیدا کر دینے والی عبارتوں کی رنگا رنگ کیاریاں جابجا پھیلی ہوئی ہیں.....ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح جڑا ہوا ہے' ایک ایک سطر شاخِ گل ہے اور ایک ایک سورت خیابانِ بہار''۔ (قرآن کی امتیازی خصوصیات)

استنبول کے دانشور صالح اوزجان کہتے ہیں کہ:

''قرآن وہ کتابِ عظیم ہے جو مخلوقات کے حق میں ازلی نصب العین اور ابدی مبصر ہے' عالمِ غیب اور دنیائے شہادت کا مفسر ہے اور معنوی خزائن کا کشاف ہے' قرآن قولِ شارح' تفسیر واضح' برہانِ قاطع اور ترجمانِ ساطع ہے۔ قرآن ضیاء الاسلام ہے' مرشد حقیقی ہے اور ہادیٔ انسانیت ہے۔ قرآن کتاب شریعت ہے' کتاب حکمت ہے' کتابِ عبودیت ہے' کتابِ دعا اور جا ہے اور کتاب ذکر و فکر ہے۔'' (سیارہ ڈائجسٹ' قرآن نمبر)

اس رفیع الشان کتاب انقلاب کے بارے میں حکیم الامت علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ:

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست
زیر گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست

''کیا تجھے معلوم بھی ہے کہ تیرا آئین و دستور کیا ہے؟ اور آسمان کے نیچے تیرے غلبہ و

اقتدار کا راز کیا ہے؟ وہ زندہ کتاب' قرآن حکیم' جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی! اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں' اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں!''

ہم نے اپنے مضمون کے آغاز میں سورۂ یونس کی جو دو آیات نقل کی ہیں اور ان میں قرآن حکیم کے جن چار اوصاف کی بات کی ہے' وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) موعظت (۲) شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (۳) ہدایت (۴) رحمت

☆ موعظت

''الوعظ'' کے معنی ایسی زجر و توبیخ کے ہیں جس میں خوف کی آمیزش ہو۔ خلیل نے اس کے معنی کیے ہیں ''خیر کا اس طرح تذکرہ کرنا جس سے دل میں رقت پیدا ہو''۔ مزید لکھتے ہیں کہ عِظَةٌ وَ مَوْعِظَةٌ دونوں اسم ہیں۔ قرآن میں ہے:

☆ ﴿يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (النحل)

''وہ (اللہ تعالیٰ) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو''۔

☆ ﴿قُلْ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ﴾ (سبا:٤٦)

''(اے نبیؐ!) کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں''۔

☆ ﴿ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ﴾ (المجادلة:٣)

''(مؤمنو!) اس حکم سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے''۔

☆ ﴿وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (هود)

''اور ان (قصص) میں تمہارے پاس حق پہنچ گیا ہے اور ان میں اہل ایمان کے لیے نصیحت اور یاددہانی بھی ہے''۔

☆ ﴿وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (آل عمران)

''اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے''۔

☆ ﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ﴾ (النساء:٦٣)

''پس تم ان کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرو اور انہیں نصیحت کرو''۔

(مفردات القرآن' جلد دوم)

موعظت کے ضمن میں صاحب معارف القرآن رقم طراز ہیں:

''مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ' مَوْعِظَہ اور وعظ کے اصل معنیٰ ایسی چیزوں کا بیان کرنا ہے

جن کو سن کر انسان کا دل نرم ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے' دنیا کی غفلت کا پردہ چاک ہو' آخرت کی فکر سامنے آ جائے۔ قرآن کریم اوّل سے آخر تک اسی موعظۂ حسنہ کا نہایت بلیغ مبلغ ہے' اس میں ہر جگہ وعدہ کے ساتھ وعید' ثواب کے ساتھ عذاب' دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی کے ساتھ ناکامی اور گمراہی وغیرہ کا ایسا ملا جلا تذکرہ ہے جس کو سن کر پتھر بھی پانی ہو جائے' پھر اس پر قرآن کریم کا اعجازِ بیان جو دلوں کی کایا پلٹنے میں بے نظیر ہے۔ مَوْعِظَةٌ کے ساتھ مِنْ رَّبِّكُمْ کی قید نے قرآنی وعظ کی حیثیت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا کہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وعظ کسی اپنے جیسے عاجز انسان کی طرف سے نہیں جس کے ہاتھ میں کسی کا نفع و نقصان یا عذاب و ثواب کچھ نہیں' بلکہ ربّ کریم کی طرف سے ہے جس کے قول میں غلطی کا امکان نہیں' اور جس کے وعدے اور وعید میں کسی عجز و کمزوری یا عذر کا کوئی خطرہ نہیں''۔ (معارف القرآن' جلد چہارم)

☆ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ

الشِّفاء من المرض: اس کا مطلب ہے سلامتی سے ہمکنار ہونا' یعنی بیماری سے شفا پانا۔ یہ مرض سے صحت یاب ہونے کے لیے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ قرآن نے شہد کے متعلق فرمایا:

☆ ﴿فِيْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ﴾ (النحل: ٦٩) ''اس میں لوگوں (کے امراض) کی شفا ہے''۔

☆ ﴿هُدًى وَّشِفَاءٌ﴾ (حٰمٓ السجدة: ٤٤) ''وہ ہدایت اور شفا ہے''۔

☆ ﴿وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (التوبة)

''اور مؤمن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشے گا''۔ (مفردات القرآن' جلد اوّل)

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''قرآن کریم کی دوسری صفت ''شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ'' ارشاد فرمائی۔ شِفَاءٌ کے معنی بیماری دور ہونے کے ہیں اور صدور صدر کی جمع ہے جس کے معنی سینہ کے ہیں' مراد اس سے قلب ہے۔ معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم دلوں کی بیماریوں کا کامیاب علاج اور صحت و شفا کا نسخۂ اکسیر ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ قرآن کی اس صفت سے معلوم ہوا کہ وہ خاص دلوں کی بیماری کے لیے شفا ہے' جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں (روح المعانی)۔ مگر دوسرے حضرات نے فرمایا کہ درحقیقت قرآن ہر بیماری کی شفا ہے خواہ قلبی و روحانی ہو یا بدنی اور جسمانی' مگر روحانی بیماریوں کی تباہی انسان کے لیے جسمانی بیماریوں سے زیادہ شدید ہے اور اس کا علاج بھی ہر شخص کے بس کا نہیں' اس لیے اس جگہ ذکر صرف قلبی و روحانی بیماریوں کا کیا گیا ہے' اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ

وہ جسمانی بیماریوں کے لیے شفا نہیں ہے۔

روایاتِ حدیث اور علمائے اُمت کے بے شمار تجربات اس پر شاہد ہیں کہ قرآن کریم جیسے قلبی امراض کے لیے اکسیرِ اعظم ہے اسی طرح وہ جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے سینے میں تکلیف ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ یعنی قرآن شفا ہے ان تمام بیماریوں کی جو سینوں میں ہوتی ہیں۔ (روح المعانی، از ابن مردویہ) .....اور مشاہدات و تجربات اتنے ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم کی مختلف آیتیں مختلف امراض جسمانی کے لیے بھی شفاءِ کلّی ثابت ہوتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ نزولِ قرآن کا اصلی مقصد قلب و روح کی بیماریوں کو ہی دُور کرنا ہے اور ضمنی طور پر جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔'' (معارف القرآن، سورۂ یونس)

قرآن حکیم کو صرف جسمانی بیماریوں اور جھاڑ پھونک کے لیے مختص کر لینا کج روی اور فکری ژولیدگی کی علامت ہے۔ قرآن کی عظمت و اہمیت کو سامنے رکھ کر اس پر غور کرنے کے بجائے اسے آفات و بلیات کا تعویذ سمجھ لینا اور اسے نزع کی سختیوں کو دور کرنے یا ایصالِ ثواب تک محدود کر لینا صحت مند اور صائب طرزِ فکر نہیں۔ قرآن حکیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے ناگزیر ہے کہ اسے ایک اعلیٰ اور برتر کلام مانا جائے اور اس عظیم تر مقصد کو پیش نظر رکھا جائے جس کے لیے قرآن نازل ہوا ہے۔

مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ جو لوگ صرف تبرک کی خاطر قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن کے اصل پیغام سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں ''ان لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ان کو ایک توپ دی گئی کہ وہ اس کے ذریعے سے شیطان کے قلعے مسمار کریں، لیکن وہ اسے مچھر مارنے کی مشین سمجھ بیٹھے''۔ (تدبر قرآن، جلد اول) ایسے ہی لوگوں کے لیے حضرت اقبال نے فرمایا:

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین او آساں بمیری!

یعنی تم نے قرآن کی آیات سے صرف اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ اس کی سورۂ یٰسین پڑھنے سے موت آسان ہو جائے۔

☆ہدایت

اَلْھِدَایَۃ کے معنی لطف و کرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں اور اسی سے ھدِیّۃٌ ہے جس کے معنی اس تحفہ کے ہیں جو بغیر معاوضہ کے دیا جائے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے چار طرح سے ہدایت کی ہے:

(i) وہ ہدایت جو عقل و فطانت اور معارفِ ضروریہ کے عطا کرنے سے کی ہے اور اس معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمیع مکلفین کو شامل ہے' بلکہ ہر جاندار چیز کو حسبِ ضرورت اس سے بہرہ ملا ہے۔

☆ ﴿رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی﴾ (طٰہٰ)

''ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی' پھر (وہ خاص اغراض پوری کرنے کی) راہ دکھائی''۔

(ii) دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہِ نجات کی طرف دعوت دی۔ چنانچہ آیت ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا.....﴾ (السجدۃ: ٢٤) ''اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے (دین کے) پیشوا بنائے تھے' جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے'' میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(iii) ہدایت بمعنی توفیق خاص آیا ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

☆ ﴿وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی﴾ (محمد: ١٧)

''اور جو لوگ رو براہ ہوں (قرآن سننے کے لیے) خدا ان کو زیادہ ہدایت دیتا ہے''۔

☆ ﴿وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ (التغابن: ١١)

''اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے''۔

☆ ﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: ٦٩)

''اور جن لوگوں نے ہمارے دین (کے کام) میں کوشش کی ہم (بھی) ان کو ضرور اپنے راستے دکھائیں گے''۔

(iv) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہوتا ہے:

☆ ﴿سَیَهْدِیْهِمْ وَیُصْلِحُ بَالَهُمْ﴾ (محمد)

''عنقریب اللہ تعالیٰ ان کی راہنمائی کرے گا اور ان کا حال درست کر دے گا (یعنی انہیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا)''۔

☆ اورآیت ﴿وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ﴾ میں آگے فرمایا:

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهۡتَدِیَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ (الاعراف:۴۳)

''شکر ہے اللہ کا جس نے ہم کو یہ راستہ دکھایا' اور اگر اللہ ہم کو راستہ نہ دکھاتا تو ہم راستہ نہ پاسکتے''۔

ہدایت کی یہ چاروں اقسام تربیتی درجات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک انسان کسی دوسرے کو صرف دعوت الی الخیر اور رہنمائی کے ذریعے ہی ہدایت کرسکتا ہے۔ باقی اقسامِ ہدایت اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔ لہٰذا جن آیات میں ہدایت کی نسبت پیغمبر یا کتاب یا دوسرے انسانوں کی طرف کی گئی ہے وہاں صرف راہِ حق کی طرف رہنمائی کرنا مراد ہے۔ چنانچہ فرمایا:

☆ ﴿وَاِنَّكَ لَتَهۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ﴾ (الشوریٰ)

''اور بے شک آپ (اے محمدؐ!) سیدھا راستہ دکھاتے ہیں''۔

☆ ﴿وَلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ﴾ (الرعد) ''اور ہر قوم کے لیے رہنما (ہوا کرتے) ہیں''۔

رحمت

الرحم کا مطلب ہے عورت کا رحم۔ اور **رَحوم** اس عورت کو کہتے ہیں جسے خرابیٔ رحم کی بیماری ہو۔ اور استعارہ کے طور پر رحم کا لفظ قرابت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے' کیونکہ تمام اقرباء ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں **رَحِمٌ** و **رُحۡمٌ** دو لغت ہیں:

☆ ﴿وَاَقۡرَبَ رُحۡمًا﴾ (الکھف)

''اور قرابت میں (اس سے) بہتر (ہو)''۔

الرَّحمۃُ کا مطلب ہے وہ رقت قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو' پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقتِ قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں' خواہ وہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔ جیسے **رَحِمَ اللّٰہُ فُلَانًا** کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے۔ جب اس کے ساتھ ذاتِ باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے صرف احسان مراد ہوگا۔ جیسا کہ مروی ہے: **ان الرحمۃ من اللّٰہ انعام وافضال ومن الآدمیّین رقۃ والتعفف** کہ اللہ کی رحمت اس کے انعام و افضال سے عبارت ہوتی ہے اور لوگوں کی طرف سے رقت و شفقت کے معنی میں آتی ہے۔ اس معنی میں آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا

ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((اَنَا الرَّحْمٰنُ هِيَ الرَّحِمُ، شَقَقْتُ لَهَا اسْمًا مِنِ اسْمِيْ مَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّه))(۱)

''(جب اللہ نے رحم پیدا کیا تو فرمایا) میں رحمان ہوں اور یہ رحم ہے۔ میں نے اس کے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے۔ جو اسے ملائے گا (یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو اسے قطع کرے گا میں اسے پارہ پارہ کر دوں گا''۔

معروف دانشور اور تعلیماتِ قرآنیہ کے نقیب ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ یونس کی ان دو آیتوں پر بڑی خوبصورت اور اثر انگیز بحث کی ہے' وہ فرماتے ہیں:

''پہلا کام یہ ہے کہ دلوں پر جو خول یا غلاف (crust) آ گیا ہے' اس کو توڑا جائے۔ اسی لیے قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلا لفظ استعمال فرمایا ''مَوْعِظَةٌ''۔ نصیحت اس بات کو کہتے ہیں جو دل میں گداز پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے' جو دل میں جا کر تیر کی طرح پیوست ہو جائے اور انسان کی طبیعت میں وہ کیفیات پیدا کر دے کہ اس کے دل میں نرمی آ جائے۔

جب یہ صورتِ حال پیدا ہو گی تو اب قرآن دل کے اندر جذب ہو جائے گا اور سرایت کر جائے گا اور نتیجتاً قلب کے جملہ امراض کے لیے شفا بن جائے گا۔ اسی لیے یہاں قرآن کا افادیت کے پہلو سے دوسرا وصف بیان فرمایا: ﴿**وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ**﴾...... قلب میں وہ روگ اور وہ امراض و عوارض جن کی طرف قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ میں اشارہ کیا گیا ہے...... وہ حبِّ دنیا ہے: ﴿**كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ**۝۲۰﴾(القیمۃ) اور: ﴿**بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا**۝۱۶﴾(الاعلیٰ)۔ وہ حبِّ مال ہے: ﴿**وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ**۝۸﴾ (العٰدیٰت)۔ وہ حبِّ شہرت ہے' وہ حبِّ حشمت و وجاہت ہے' وہ حبِّ اقتدار ہے' وہ حبِّ شہوات و لذات ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہوں نے اس دنیا کو جہنم کا نمونہ بنا دیا ہے......نوعِ انسانی کے لیے قرآن میں افادیت کا جو تیسرا پہلو ہے اسے اس آیت مبارکہ میں ''هُدًى'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یعنی قرآن سراپا ہدایت ہے۔ یہ ہدایت کیا ہے! اس سے دراصل مراد ہے انسان کی ذہنی و فکری رہنمائی......ترتیب یہ ہے کہ پہلے دل کے اندر گداز ہو' پھر قلب کے امراض و رذائل کا مداوا اور ازالہ ہو۔ اب گویا پردے ہٹ گئے' حجابات دور ہو

---

(۱) سنن ابی داوٗد، کتاب الزکاۃ، باب فی صلۃ الرحم۔

گئے۔ اب قرآنِ حمید انسانی فکر کے لیے رہنمائی ہے' انسانی سوچ کے لیے رہنمائی ہے' انسانی مسائل کے لیے رہنمائی ہے.....

آیت مبارکہ کے آخری حصے پر توجہ مرکوز کیجیے! نہایت جامع الفاظ ہیں: ﴿وَرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ ''اور (یہ قرآن) اہل ایمان کے لیے مجسم رحمت ہے۔'' گویا رحمتِ خداوندی کا سب سے بڑا مظہر خود قرآن ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿الرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ﴾ (الرحمٰن) یعنی اُس ہستی نے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح پُر جوش ہے' بلکہ اس کی رحمانیت کے مقابلہ میں سمندر کا ہیجان پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا' اِس قرآن کا علم عطا کیا ہے۔ اس نے اپنے محبوب اور رحمۃ للعالمین حضرت محمد ﷺ کو اس قرآن کی تعلیم دی ہے''۔ (میثاق' اکتوبر ۲۰۰۵ء)

سورۂ یونس کی آیت ۵۸ کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''لوگ دولتِ دنیا کو قیمتی متاع سمجھتے ہیں اور اس کو جمع کرنے میں حلال و حرام تک کی تمیز نہیں کرتے۔ یہ چیزیں ان کو جہنم کا ایندھن بنانے والی ہیں' جبکہ قرآن رشد و ہدایت کی صراطِ مستقیم ہے جس پر عمل کرنے پر ہی آخرت کی فوز و فلاح اور کامرانی کا اصل دارو مدار ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ایک ارشادِ مبارک کا مفہوم ہے کہ قرآن مجید جیسی عظیم دولت کے مقابلہ میں اگر کسی کو یہ خیال آیا کہ دولتِ دُنیوی اس سے بڑی دولت ہے تو وہ کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوا۔ ظاہر بات ہے اللہ کی نعمت کے کفران کا نتیجہ آخرت میں اللہ کی سزا اور دنیا میں رسوائی اور خواری کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے!'' (میثاق' اکتوبر ۲۰۰۵ء)

اس آیۂ کریمہ میں جن چیزوں کو فرحت و مسرت کا موجب قرار دیا گیا ہے وہ ایک تو فضل ہے اور دوسری رحمت۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ کے فضل سے مراد قرآن ہے اور رحمت سے مراد یہ ہے کہ تم کو قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشی''۔ (روح المعانی' از ابن مردویہ)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فضل سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں' قرآن کریم کی آیت ﴿وَمَا اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ﴾ سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ (معارف القرآن)

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''ان چار اوصاف (مَوۡعِظَةٌ ' شِفَآءٌ ' هُدًى ' رَحۡمَةٌ) کی تشریح میں صاحب روح المعانی نے لکھا ہے (بعض محققین کے حوالہ سے) کہ نفس انسانی کے لیے حصولِ کمال

میں چار مرتبے یا منزلیں ہیں اوران میں سے ہر لفظ ایک مرتبہ یا منزل کی جانب اشارہ کر رہا ہے: (۱) پہلا مرتبہ تہذیب ظاہر کا یعنی معاصی اور اعمالِ بد سے بچنے کا ہے۔ مَوْعِظَةٌ اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ (۲) دوسرا مرتبہ تہذیب باطن کا یعنی اخلاقِ ذمیمہ وعقائد فاسدہ سے بچنے کا ہے۔ اس کو شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۳) تیسرا مرتبہ عقائد حقہ واخلاق فاضلہ سے آراستہ ہونے کا ہے۔ یہ منزل هُدًی کی ہے۔ (۴) چوتھا مرتبہ انوار الٰہی سے جگمگا اٹھنے کا ہے اور یہ حاصل ہے مقامِ رحمت کا۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ خطاب کا عموم ملحوظ رہے۔ یٰٓاَیُّهَا الْعَرَبُ ارشاد نہیں ہو رہا' مخاطب ساری دنیا ہے کوئی مخصوص قوم یا ملک نہیں۔ مَوْعِظَةٌ یعنی ایسی کتاب جو برائیوں سے روکنے اور نیکیوں کی ترغیب کے لیے ایک مکمل نصیحت نامہ ہے' افراد و اشخاص کے حق میں بھی اور اقوام و جماعات کے حق میں بھی۔ 'شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ' یعنی ایسی کتاب کہ اگر اس کی ہدایتوں پر عمل ہو تو ہر قسم کے امراض قلب اور عوارض باطن کو' خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی' شفاء ہو جائے۔ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ کی قید اس لیے ہے کہ مؤمنین ہی تو اس کی ان صفات سے استفادہ کریں گے''۔ (تفسیر ماجدی)

صاحب تدبر قرآن نے قرآن حکیم سے استفادہ کے لیے اپنی تفسیر میں جو ہدایات درج کی ہیں ان میں سب سے پہلے نمبر پر نیت کی پاکیزگی ہے' یعنی آدمی قرآن مجید کو صرف طلب ہدایت کے لیے پڑھے' کسی اور غرض کو سامنے نہ رکھے۔ طلبِ ہدایت کے سوا کوئی غرض ہو گی تو قاری قرآن کے فیض سے محروم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے اندر طلبِ ہدایت کا جو داعیہ ودیعت فرمایا ہے اگر اس داعیہ کے تحت قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ بقدرِ کوشش اور بقدرِ توفیق الٰہی اس سے فیض پاتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک اعلیٰ اور برتر کلام مان کر اس پر غور کیا جائے اور سمجھا جائے۔ قرآن مجید ایک عظیم تاریخ رکھتا ہے۔ جتنا بڑا انقلاب دنیا میں اس کتاب نے برپا کیا اتنا بڑا انقلاب کسی کتاب نے بھی برپا نہیں کیا۔ تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر قرآن مجید کے مطابق ظاہر و باطن کو بدلنے کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ قرآن پر تدبر کیا جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن کو برابر تدبر کے ساتھ پڑھتے تھے' محض تبرک کے طور پر الفاظ کی تلاوت کر لینا اور معانی کی طرف دھیان نہ کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ نہ تھا۔ قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے کی پانچویں شرط یہ ہے کہ اس کی مشکلات میں آدمی بددل اور مایوس نہ ہو' اپنی الجھن کو اپنے ربّ کے سامنے پیش

کرے اور اسی سے مدد اور رہنمائی کا طلب گار رہو' ہر لحظہ اللہ سے دعا کرے کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ بِکُلِّ اسۡمٍ هُوَ لَکَ ، سَمَّیۡتَ بِهٖ نَفۡسَکَ ، اَوۡ عَلَّمۡتَهٗ اَحَدًا مِّنۡ خَلۡقِکَ ، اَوۡ اَنۡزَلۡتَهٗ فِیۡ کِتَابِکَ ، اَوِ اسۡتَاۡثَرۡتَ بِهٖ فِیۡ مَکۡنُوۡنِ الۡغَیۡبِ عِنۡدَکَ ، اَنۡ تَجۡعَلَ الۡقُرۡآنَ الۡکَرِیۡمَ رَبِیۡعَ قَلۡبِیۡ وَنُوۡرَ صَدۡرِیۡ وَجَلَاءَ حُزۡنِیۡ وَذَهَابَ هَمِّیۡ وَغَمِّیۡ

''میں تجھ سے تیرے ہر اُس نام کے واسطے سے درخواست کرتا ہوں جس سے تو نے اپنے آپ کو موسوم فرمایا ہے' یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو تلقین فرمایا ہے' یا جس کو تو نے اپنی کسی کتاب میں نازل فرمایا ہے' یا اسے اپنے مخصوص خزانہ غیب ہی میں محفوظ رکھا ہے' کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار' میرے سینے کا نور' میرے غم کا مداوا اور میری فکر و پریشانی کا علاج بنا دے!''

اقامت دین کی پرخطر اور دشوار گزار راہوں میں صبر و عزیمت اور اولوالعزمی کا ہتھیار قرآن حکیم سے تمسک کی بدولت ہی میسر آ سکتا ہے۔ قرآن مجید کتابِ دعوت ہے اور نوعِ انسانی کے لیے رشد و ہدایت اور رحمت کا سرچشمہ بھی ہے۔ داعیٔ حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتابِ مبین کے ان نمایاں اوصاف کو اپنے اندر جذب کرے اور ترحم و تلطف کے جذبوں کے ساتھ خیر و بھلائی کی دعوت کو پیش کرے۔ اس کی کامیابی کا راز حبل اللہ سے وابستہ اور پیوستہ رہنے ہی میں مضمر ہے۔ ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن!

اخذ و استفادہ

(۱) مفردات القرآن' جلد اوّل و دوم (۲) تدبر قرآن' جلد اوّل
(۳) معارف القرآن' جلد چہارم (۴) تفسیر ماجدی
(۵) سیارہ ڈائجسٹ' قرآن نمبر (۶) ماہنامہ میثاق' اکتوبر ۲۰۰۵ء

تفہیم دین

فضائل عشرۂ ذی الحجہ
اور ہمارے کرنے کے کام

حافظ طاہر اسلام عسکری

اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنے بندوں پر یہ خصوصی فضل وکرم ہے کہ اس نے نیکی واطاعت کے لیے کچھ خاص اوقات مقرر فرما دیے ہیں جن میں اعمالِ صالحہ کا اجر کئی گنا بڑھ جاتا ہے اور باری تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ بطورِ خاص بنی نوع انسان کی طرف متوجہ ہوتی ہے' تاکہ لوگ اس میں زیادہ سے زیادہ نیک عمل کر کے اپنے پروردگار کا قرب حاصل کر سکیں۔ بڑے ہی خوش قسمت اور سعادت مند ہیں وہ افراد جو ایسے لمحات کی قدر کر کے ان سے صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں اور لاپرواہی' سستی اور کوتاہی کی بجائے خوب محنت کرتے ہیں۔ ان اشرف واعلیٰ اوقات میں عشرۂ ذی الحجہ بھی شامل ہے۔ قرآن اور سنت رسولؐ میں ذی الحجہ کے پہلے دس ایام کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ذیل میں عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل' اس میں عمل کی فضیلت اور مستحب اعمال کا ذکر کیا جاتا ہے۔

☆عشرۂ ذی الحجہ کا استقبال

جو اوقات ولمحات خصوصی اہمیت وفضیلت کے حامل ہوں ان کے شایانِ شان اہتمام سے ان کا استقبال کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں چند امور بطورِ خاص قابل لحاظ ہیں:

(ا) سچی توبہ: مسلمان کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ نیکی واطاعت کی ان بابرکت گھڑیوں کا استقبال سچی توبہ سے کرے اور اللہ کی طرف رجوع کا پکا ارادہ کرے' کیونکہ توبہ ہی میں بندۂ مؤمن کے لیے دنیا وآخرت کی کامیابی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتُوبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّـهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (النور)

''اے ایمان والو! تم سب مل کر اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ۔''

(۲) ایامِ فضیلت سے فائدہ اٹھانے کا پختہ عزم: مسلمان کو چاہیے کہ ان ایام میں زیادہ سے زیادہ صالح اعمال واقوال کے ذریعے رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش کرے اور اس بات کا عزمِ مصمم کرے کہ ان مبارک اوقات میں وہ بڑھ چڑھ کر نیکی کرے گا۔ جو شخص کسی چیز کا پختہ قصد کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے اور ایسے اسباب مہیا فرما دیتا ہے جو عمل کی تکمیل میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت:٦٩)

''اور جن لوگوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہم ان کو ضرور اپنے (قرب کے) راستے دکھلائیں گے۔''

(۳) معاصی سے اجتناب: جس طرح اعمالِ صالحہ قربِ الٰہی کا موجب ہیں اسی طرح معصیت اور نافرمانی کے کام اللہ تعالیٰ سے دُوری اور رحمت خداوندی سے بُعد کا سبب بنتے ہیں۔ انسان اپنے گناہوں کی وجہ سے اللہ جل شانہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے گناہ بخشے جائیں اور جہنم سے نجات حاصل ہو تو اسے ان ایامِ رحمت میں خصوصاً اور دیگر دنوں میں عموماً اللہ کی نافرمانی اور حدودِ الٰہی کی پامالی سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔

مذکورہ بالا تینوں امور انتہائی اہمیت کے حامل ہیں، جنہیں پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ان بابرکت لمحات سے فائدہ اٹھائیں اور احسن طریقے سے ان کا استقبال کریں، قبل اس کے کہ یہ دن گزر جائیں اور ہم حسرت وندامت سے ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ لیکن اُس وقت پچھتانے کا کیا فائدہ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت!

☆عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت

ذوالحجہ کے عشرۂ اوّل کی فضیلت کئی پہلوؤں سے اجاگر ہوتی ہے:

(۱) خدا تعالیٰ نے ان دنوں کی قسم کھائی ہے: اللہ عزوجل کا کسی شے کی قسم کھانا اس کی عظمت وفضیلت کی واضح دلیل ہے، اس لیے کہ جو ذات خود عظیم ہو وہ صاحب عظمت شے ہی کی قسم کھاتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَالْفَجْرِ ① وَلَيَالٍ عَشْرٍ ②﴾ (الفجر) ''قسم ہے فجر کی، اور دس راتوں کی۔''

مفسرین کی عظیم اکثریت کے مطابق ان دس راتوں سے مراد ذوالحجہ کی پہلی دس راتیں ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں اسی کو صحیح کہا ہے۔

(۲) یہی ''ایامِ معلومات'' ہیں: قرآن مجید میں جن اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ میں ذکر الٰہی کا بیان

خصوصیت سے کیا گیا ہے جمہور اہل علم کے نزدیک وہ یہی دس دن ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ﴾ (الحج:۲۸)

''اور چند معلوم دنوں میں جو چوپائے جانور اللہ نے ان کو دیے ہیں ان پر اللہ کا نام لیں۔''

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی ان ایامِ معلومات سے ذوالحجہ کے دس دن ہی مراد لیے ہیں۔

(۳) رسول اکرم ﷺ کی شہادت: حضور نبی کریم ﷺ نے ان دنوں کو سب سے اعلیٰ و افضل قرار دیا ہے۔ پیغمبر اعظم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''دنیا کے افضل ترین دن ایام العشر (یعنی ذوالحجہ کے دس دن) ہیں۔ دریافت کیا گیا کہ کیا جہاد فی سبیل اللہ کے ایام بھی ان کی مثل نہیں؟ فرمایا: ''جہاد فی سبیل اللہ میں بھی ان کی مثل نہیں سوائے اس شخص کے جس کا چہرہ مٹی میں لتھڑ جائے (یعنی وہ شہید ہو جائے)''۔ (بزار، ابن حبان)

(۴) ان میں ''یومِ عرفہ'' ہے: حج کا رکن اعظم یومِ عرفہ بھی انہی ایام میں ہے۔ یہ دن انتہائی شرف وفضیلت کا حامل ہے۔ یہ گناہوں کی بخشش اور دوزخ سے آزادی کا دن ہے۔ اگر عشرۂ ذی الحجہ میں سوائے یومِ عرفہ کے اور کوئی قابل ذکر یا اہم شے نہ بھی ہوتی تو یہی اس کی فضیلت کے لیے کافی تھا۔ اس سلسلے میں کئی احادیث مروی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسولِ معظم ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ يَوْمٍ اَكْثَرَ مِنْ اَنْ يُعْتِقَ اللّٰهُ فِيْهِ عَبْدًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ))[1]

''اللہ تعالیٰ جس قدر عرفہ کے دن لوگوں کو آگ سے آزاد فرماتا ہے اس سے زیادہ کسی اور دن آزاد نہیں کرتا۔''

ایک اور حدیث نبویؐ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''شیطان یومِ عرفہ کے علاوہ کسی اور دن میں اپنے آپ کو اتنا چھوٹا، حقیر، ذلیل اور غضبناک محسوس نہیں کرتا جتنا اس دن کرتا ہے۔ یہ محض اس لیے ہے کہ اس دن میں وہ اللہ کی رحمت کے نزول اور انسانوں کے گناہوں سے صرفِ نظر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ البتہ بدر کے دن شیطان نے اس سے بھی بڑی شے دیکھی تھی''۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ! یومِ بدر اس نے کیا دیکھا؟ فرمایا: ''جبرئیل کو جو فرشتوں کی صفیں ترتیب دے رہے تھے''۔ (مالک، عبدالرزاق۔ یہ روایت مرسل صحیح ہے)

یوم عرفہ کے روزے کی بھی بہت فضیلت ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

(۵) انہی ایام میں ''یوم نحر'' ہے: بعض علماء کے نزدیک یوم نحر پورے سال میں سب سے افضل ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّ اَعْظَمَ الْاَیَّامِ عِنْدَ اللّٰہِ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی یَوْمُ النَّحْرِ ثُمَّ یَوْمُ الْقَرِّ))

''اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں سب سے عظمت والا دن یوم نحر (دس ذی الحجہ) ہے' پھر یوم القر (یعنی اس سے اگلا گیارہ ذی الحجہ کا دن) ہے۔''

تنبیہ: ''القر'' قرار (ٹھہرنے) سے ہے۔ اس میں لوگ منیٰ میں قیام کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اسے ''یوم القر'' کہتے ہیں۔

(۶) اسی عشرہ میں عظیم عبادات جمع ہوتی ہیں: شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہری طور پر عشرۂ ذی الحجہ کے امتیاز کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بڑی بڑی عبادتیں جمع ہو جاتی ہیں' یعنی نماز' روزہ' صدقہ اور حج۔ ان کے علاوہ دیگر ایام میں ایسا نہیں ہوتا۔ (فتح الباری)

☆عشرۂ ذی الحجہ میں عمل کی فضیلت

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ معظم ﷺ نے فرمایا:

((مَا الْعَمَلُ فِیْ اَیَّامٍ اَفْضَلَ مِنْھَا فِیْ ھٰذِہٖ)) قَالُوْا: وَلَا الْجِھَادُ؟ قَالَ: ((وَلَا الْجِھَادُ اِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ یُخَاطِرُ بِنَفْسِہٖ وَمَالِہٖ فَلَمْ یَرْجِعْ بِشَیْءٍ))[۳]

''ذی الحجہ کے دس دنوں میں خدا کو نیک عمل جتنا محبوب ہے اس کے علاوہ دیگر دنوں میں نہیں''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: کیا اللہ کے راستے میں جہاد بھی (ان دنوں کے عمل سے بڑھ کر نہیں)؟ فرمایا: ''نہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں' سوائے اس شخص کے جو اپنی جان و مال کے ساتھ نکلا اور ان میں سے کسی چیز کے ساتھ واپس نہ لوٹا (یعنی شہید ہو گیا)''۔

اسی مفہوم کی روایت سیدنا ابن عمرؓ کے حوالے سے مسند احمد میں بھی موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ ذوالحجہ کے پہلے دس ایام میں کیا گیا عمل دیگر دنوں میں کیے گئے نیک اعمال سے اللہ تبارک و تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔ یہ اس کے افضل ہونے کی دلیل ہے۔ نیز یہ بھی پتا چلا کہ عشرۂ ذی الحجہ میں اعمالِ صالحہ بجالانے والا اس مجاہد فی سبیل اللہ سے بھی زیادہ اجر وفضیلت کا مستحق ہے جو اپنے مال وجان کے ساتھ بخیریت میدانِ جنگ سے واپس آ جاتا ہے۔

☆عشرۂ ذی الحجہ میں مستحب اعمال

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ دن اللہ تبارک وتعالیٰ کی خصوصی عنایت وشفقت کا باعث اور اللہ عزوجل کی جانب سے اپنے بندوں پر اس کے فضل کا موجب ہے تو ہمیں ان بابرکت لمحات میں بڑھ چڑھ کر نیک اعمال کرنے چاہئیں۔ اجر وثواب کے خاص خاص اوقات کے بارے میں سلف صالحین رحمہم اللہ کا یہی طریقہ کار تھا۔ ابوعثمان الہندیؒ فرماتے ہیں:

''سلف تین عشروں کو بہت عظیم سمجھتے تھے: (۱) رمضان المبارک کا آخری عشرہ (۲) ذی الحجہ کا پہلا عشرہ۔ اور (۳) ماہِ محرم الحرام کا پہلا عشرہ۔''

عشرۂ ذی الحجہ میں جو اعمال مستحب ہیں اور جنہیں زیادہ سے زیادہ بجالانا چاہیے وہ یہ ہیں:

(۱) حج وعمرہ کی ادائیگی: عشرۂ ذی الحجہ میں کیے جانے والے تمام اعمالِ صالحہ میں سے افضل عمل حج بیت اللہ اور عمرہ کی ادائیگی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلوص واخلاص کے ساتھ حج اور عمرہ ادا کرنے کی توفیق میسر آجائے اس کی جزا صرف جنت ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْعُمْرَةُ اِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِّمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهٗ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةُ))(۴)

''ایک عمرے کے بعد دوسرے عمرے کی ادائیگی ان دونوں کے مابین کیے گئے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے اور حج مبرور کا بدلہ سوائے جنت کے اور کچھ نہیں۔''

حج مبرور سے مراد وہ حج ہے جو سنت نبویؐ کے مطابق کیا جائے، جس میں ریا کاری، نمود ونمائش، شہوت کی بات اور کسی قسم کی معصیت ونافرمانی نہ کی جائے، بلکہ نیکی اور بھلائی کے کام زیادہ سے زیادہ کیے جائیں۔

(۲) روزہ رکھنا: روزہ بھی نیک اعمال میں شامل ہے، بلکہ افضل ترین عمل ہے۔ اس کی عظمت شان اور علو مرتبت کی وجہ سے اللہ جل شانہ نے اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((كُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ لَهٗ اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ))(۵)

''ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزے کے، کہ وہ صرف میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔''

نبی مکرم ﷺ نے عشرۂ ذی الحجہ کے دیگر ایام میں سے ۹ ذی الحجہ (یومِ عرفہ) کے روزے

کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے اور اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((صِيَامُ يَوْمِ عَرَفَةَ أَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِىْ قَبْلَهٗوَالسَّنَةَ الَّتِىْ بَعْدَهٗ)) (٦)

''یومِ عرفہ کے روزے کے بارے میں مجھے خدا سے امید ہے کہ یہ ایک سال پہلے کے اور ایک آئندہ آنے والے سال کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔''

لہٰذا ۹ ذوالحجہ کا روزہ رکھنا سنت اور مستحب ہے' کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے اس کی ترغیب دلائی ہے۔ امام نوویؒ کے نزدیک پورے عشرے کے روزے رکھنا مستحب ہے۔ فرماتے ہیں:

صيامها مستحب استحبابا شديدا

''عشرۂ ذی الحجہ کے روزے انتہائی درجے میں مستحب ہیں''۔

(۳) نماز اور نوافل: نماز بھی جلیل القدر اور افضل ترین عبادات میں شامل ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو بروقت اور باجماعت نماز ادا کر کے اس پر محافظت اور ہمیشگی کرنی چاہیے۔ عشرۂ ذی الحجہ میں فرض نمازوں پر خصوصی توجہ کے ساتھ ساتھ کثرت سے نوافل بھی ادا کرنے چاہئیں۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کی نیکی ہے۔ رسول اکرم ﷺ پروردگارِ عالم سے روایت کرتے ہیں:

((وَمَا يَزَالُ عَبْدِىْ يَتَقَرَّبُ اِلَىَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ)) (۷)

''بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے تا آنکہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔''

(۴) تکبیر، تحمید، تہلیل اور ذکر: ذوالحجہ کے ان پرانوار ایام میں ذکرِ الٰہی اور تکبیر و تحمید کا بھی کثرت سے اہتمام کرنا چاہیے۔ سیدنا ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبیٔ مکرم ﷺ نے فرمایا:

''ان دس دنوں سے بڑھ کر کوئی دن ایسا نہیں کہ جس میں کیا گیا عمل خدا تعالیٰ کے ہاں ان سے زیادہ عظیم اور محبوب ہو' پس تم ان دنوں میں تہلیل (لا الٰہ الا اللہ)' تکبیر (اللہ اکبر) اور تحمید (الحمدللہ) کی کثرت کرو''۔ (مسند احمد)

یاد رہے کہ جونہی ذی الحجہ کا چاند نظر آ جائے تکبیرات شروع کر دینی چاہئیں اور اس سارے عشرے میں یہ معمول جاری رہنا چاہیے۔ امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ:

''سیدنا ابن عمرؓ اور سیدنا ابو ہریرہؓ عشرۂ ذی الحجہ کے دوران بازار میں نکلتے تو تکبیرات کہتے اور انہیں سن کر لوگ بھی تکبیرات کہتے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے بارے میں مروی ہے کہ آپؓ منیٰ میں اپنے خیمے میں تکبیرات کہتے اور مسجد والے لوگ ان کی آواز سن

کر اس میں شریک ہو جاتے۔ اس طرح ایام منیٰ میں سیدنا ابن عمرؓ نمازوں کے بعد' اپنے بستر پر' اپنے خیمے میں' اپنی مجلس میں اور چلتے ہوئے تکبیرات میں مشغول رہتے۔ لہٰذا ان تمام ایام میں زیادہ سے زیادہ بآوازِ بلند تکبیرات کہنی چاہئیں۔ البتہ اجتماعی انداز میں تکبیرات کہنے کا رسول اکرم ﷺ اور سلف صالحین سے کوئی ثبوت نہیں' لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص انفرادی طور پر تکبیرات کہے''۔

(۵) صدقہ وخیرات: صدقہ وخیرات بھی عمومی طور پر ان اعمالِ صالحہ میں شامل ہے جو اِس عرصہ میں کثرت سے کرنے چاہئیں۔ اللہ جل جلالہ نے اس کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (البقرة)

''اے اہل ایمان! جو کچھ مال ومتاع ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے کہ جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی' نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔''

صدقہ وخیرات کی فضیلت وبرکت کے بارے میں نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ))[۸] ''صدقہ مال کو کم نہیں کرتا۔''

(۶) قربانی: ۱۰ ذی الحجہ یعنی عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کرنا بھی افضل ترین اعمال میں سے ہے۔ یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت ہے۔ اگرچہ فرض تو نہیں' تاہم سنت مؤکدہ ہے۔ لہٰذا صاحب حیثیت مسلمان کو قربانی ضرور کرنی چاہیے۔ قربانی کا جانور عیوب و نقائص سے پاک ہونا چاہیے۔ اس کا گوشت خود بھی کھانا چاہیے اور فقراء ومساکین اور عزیز و رشتہ دار افراد میں بھی تقسیم کرنا چاہیے۔ یاد رہے کہ حدیث نبویؐ ہے کہ جو شخص قربانی کرنا چاہے وہ ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔ اس حوالے سے ایک سنت یہ بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ عیدالاضحیٰ کے دن نماز سے پہلے کچھ نہیں کھاتے تھے' بلکہ بعد میں کھاتے تھے۔

(۷) نمازِ عید کی ادائیگی: قربانی کرنے سے پہلے عیدالاضحیٰ کی نماز کی ادائیگی بھی ایک بڑی عظیم سنت ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے افراد عید نماز ادا کرنے میں کوتاہی وسستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور عید کے بعد دعا سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ بڑی کم نصیبی ہے۔ رسول

معظم ﷺ نے تو ان خواتین کو بھی عید کے بعد کی دعا میں شامل ہونے کی ترغیب دلائی ہے جو اپنے مخصوص ایام کی وجہ سے نمازِ عید الاضحیٰ ادا نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا اس باب میں ذوق وشوق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس عبادت میں شامل ہونا چاہیے۔

(۸) متفرق اعمال: علاوہ ازیں ان ایام میں دیگر تمام نیک اعمال کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت ومشقت کرنی چاہیے اور مجاہدۂ نفس کے ذریعے خوشنودیٔ رب کی تلاش میں منہمک ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں درج ذیل اعمال پر بطورِ خاص توجہ دینی چاہیے: تلاوت وتعلّم قرآن، استغفار، والدین سے حسن سلوک، صلہ رحمی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، زبان اور شرم گاہ کی حفاظت، ہمسایوں سے حسن سلوک، اکرامِ ضیف، لوگوں کے کام آنا (خدمت خلق)، رسول اکرم ﷺ پر کثرت سے درود وسلام، کسب حلال کے لیے محنت کرنا، عیادتِ مریض، کفالت یتامیٰ وغیرہ۔

باری تعالیٰ ہمیں ان مبارک لمحات سے بھرپور استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری جملہ عبادات کو شرفِ قبولیت سے نواز کر ذریعۂ نجات بنائے۔ آمین!

وصلی اللّٰہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم تسلیما مزیداOO

حواشی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فی فضل الحج والعمرة ویوم عرفة۔

(۲) سنن ابی داوٗد، کتاب المناسك، باب فی الهدی اذا عطب قبل ان یبلغ۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب فضل العمل فی ایام التشریق۔

(٤) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب وجوب العمرة وفضلها۔ وصحیح مسلم، کتاب الحج، باب فی فضل الحج والعمرة ویوم عرفة۔

(٥) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب ما یذکر فی المسك۔ وصحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فی فضل الصیام۔

(٦) صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب استحباب صیام ثلاثة ایام من کل شهر وصوم یوم عرفة.....

(۷) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع۔

(۸) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع۔

ناموسِ رسالت

عقیدۂ ختم نبوت

اور

قادیانیت کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں

حافظ محمد مشتاق ربانی

آنحضورﷺ کے اسماءِ مبارکہ میں سے ایک نام **الخاتم** ہے۔ کلامِ عرب میں خاتم کا لفظ جب کسی قوم یا جماعت کی طرف مضاف ہو تو اس کے معنی ''آخری'' کے ہوتے ہیں۔ جیسے **خاتم القومِ** کا مطلب ہے قوم کا آخری فرد۔

خاتم النبیین کی ترکیب سورۃ الاحزاب میں وارد ہوئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَـآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰـكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ﴾ (آیت ۴۰)

''(لوگو!) محمد (ﷺ) تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔''

کلمہ ''خاتم'' کی دو قراءتیں روایت کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ابوعمرو الدانی ''کتاب **التیسیر فی القراءات السبع**'' میں لکھتے ہیں کہ امام عاصم الکوفی (ت ۱۲۷ھ) نے خاتم کو ''ت'' کی فتح (زبر) کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ جمہور قراء نے ''ت'' کی کسرہ (زیر) کے ساتھ پڑھا ہے[۱]۔ ان دونوں قراءتوں کے مطابق خاتم النبیین کے دو معانی ہیں:

(۱) آخر النبیین، یعنی آخری نبی۔ جیسا کہ آنحضورﷺ نے فرمایا: ((اَنَا آخِرُ الْاَنْبِيَاءِ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ))[۲] ''میں تمام انبیاء میں سے آخری نبی ہوں اور تم سب اُمتوں میں سے آخری اُمت ہو۔''

(۲) انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ کو ختم کرنے والے۔

مذکورہ بالا دونوں معانی پر غور کیا جائے تو دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کہ نبی اکرم حضرت محمد ﷺ انبیاء کرامؑ کے آخر ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ جیسا کہ امام راغب اصفہانی اپنی کتاب ''مفردات القرآن'' میں لکھتے ہیں:

"وخاتم النبيين لانه ختم النبوة اى تممها بمجيئه"(۳)

یعنی آنحضرت ﷺ کو خاتم النبیین اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپؐ نے نبوت کے سلسلہ کو ختم کر دیا، یعنی آپؐ نے تشریف فرما ہو کر نبوت کو تمام کر دیا۔

اپنے خاتم النبیین ہونے کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کی کئی احادیث ہیں۔ جیسا کہ مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''اکفار الملحدین والمتأولین فی شیء من ضروریات الدین'' میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

''مفتی صاحب نے اپنے ایک رسالہ میں ۱۵۰ سے زائد احادیث نبویہ ختم نبوت کے بارے میں جمع کیں، جن میں سے تقریباً تیس روایات تو صحاحِ ستہ کی ہیں اور باقی دوسری کتب کی''۔(٤)

آنحضرت ﷺ نے نبوت و رسالت کے سلسلہ کو ایک محل سے تشبیہ دی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ مَثَلِیْ وَمَثَلَ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بَیْتًا فَاَحْسَنَهٗ وَاَجْمَلَهٗ اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِیَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ یَطُوْفُوْنَ بِهٖ وَیَعْجَبُوْنَ لَهٗ وَیَقُوْلُوْنَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ ' قَالَ فَاَنَا اللَّبِنَةُ وَاَنَا خَاتِمُ النَّبِیِّیْنَ))(٥)

''میری اور مجھ سے پہلے رسولوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی آدمی نے بہت حسین و جمیل گھر بنایا ہو مگر اس میں کہیں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی ہو۔ پھر لوگوں نے اُس میں گھوم پھر کر دیکھا تو اُسے بہت خوبصورت پایا اور کہنے لگے کاش یہ اینٹ بھی لگا دی جاتی۔ تو میں وہ اینٹ ہوں (جس سے یہ عمارت مکمل ہوگئی ہے) اور میری آمد کے بعد اب رسولوں کی آمد بند کر دی گئی ہے''۔

عقیدۂ ختم نبوت کا قائل ہونا ''مسلمان'' کی تعریف کا لازمی جزو ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن اپنی کتاب ''اسلامی قانونِ ارتداد'' میں ''مسلمان'' کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''ہر وہ شخص مسلمان ہے جو خدا کو ایک اور حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی مانتا ہو اور

ضروریاتِ دین کو جو اجماعِ اُمت سے ثابت ہیں' تسلیم کرتا ہو اور ان کی پابندی کا زبان سے اقرار کرتا ہو''۔(۶)

عقیدۂ ختم نبوت اسلام کی روح ہے۔ جیسا کہ ۱۹۵۴ء میں جب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ''مجلس تحفظ ختمِ نبوت'' کے صدر منتخب ہوئے تو آپ نے پریس کے نام یہ بیان جاری کیا:

''مسئلہ ختم نبوت جانِ اسلام اور روحِ قرآن ہے۔ اگر مسلمان عقیدۂ ختم نبوت سے بال برابر اِدھر اُدھر ہو جائیں گے تو پھر نہ محمد عربی ﷺ کا قرآن باقی رہتا ہے اور نہ ہی خدا تعالیٰ کا وہ تقدس اور توحید باقی رہتی ہے جن پر آدم علیہ السلام سے لے کر ختمی المرتبت ﷺ تک انبیاء کرام متفق ہیں''۔(۷)

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:۔

رُخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری چشم خیال میں' نہ دکانِ آئینہ ساز میں

ختم نبوت دراصل انسانیت پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا احسان ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

''عقیدۂ ختم نبوت درحقیقت نوعِ انسانی کے لیے ایک شرف و امتیاز ہے' وہ اس بات کا اعلان ہے کہ نوعِ انسانی سن بلوغ کو پہنچ گئی ہے اور اس میں یہ لیاقت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کو قبول کرے۔ اب انسانی معاشرے کو کسی نئی وحی' کسی نئے آسمانی پیغام کی ضرورت نہیں''۔(۸)

دین اور عقیدہ کے لحاظ سے آج ہم جس بڑے فتنے کا شکار ہیں وہ قادیانیت ہے جس نے ختم نبوت کے محل کو گرانے کی کوشش کی' جنہیں بالآخر ستمبر ۱۹۷۴ء کو قانونی طور پر غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ لیکن اِن قادیانیوں نے اپنی سرگرمیوں کو ختم کرنے کی بجائے ان کو برقرار رکھا۔ دوسری طرف ہم انہیں غیر مسلم قرار دلوانے کے بعد کسی قدر مطمئن ہو گئے' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں پنپنے کا موقع مل گیا۔

۴/اکتوبر ۲۰۰۸ء کو روزنامہ ''اُمت'' (کراچی) نے لندن سے شائع ہونے والے اخبار لندن پوسٹ کی ایک رپورٹ شائع کی ہے کہ ۶۰۰ پاکستانی قادیانی اسرائیل ڈیفنس فورسز میں مختلف عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔ اس بات کا انکشاف ایک یہودی محقق ڈاکٹر آئی ٹی ٹونی

نے اپنی کتاب ''Israel A Profile'' میں کیا ہے۔ اسی طرح الطاف حسین (متحدہ قومی موومنٹ کا قائد) قادیانیوں کی مظلومیت کا چرچا کر رہے ہیں' بلکہ وہ تو کراچی اور حیدر آباد (سندھ) میں قادیانی مراکز کو تحفظ فراہم کرنے کی یقین دہانی کروا رہے ہیں۔ گویا یہ وہی بات ہے جو قرآن حکیم نے یہود کے بارے میں ارشاد فرمائی:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾

(آل عمران:۱۱۲)

''یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی' کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو اور بات ہے۔''

اِن قادیانیوں کے بارے میں ﴿ بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ کی صورت تو نظر نہیں آ رہی' البتہ ﴿حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ کی صورت پوری طرح مطابقت رکھتی ہے کہ اگر دنیا میں کہیں ان کو تھوڑا بہت امن وچین ملا ہے تو وہ ان کو اپنے بل بوتے پر نہیں ملا بلکہ کسی غیر مسلم ریاست نے اپنے طور پر انہیں اپنی حمایت میں لے لیا ہے۔

اِن قادیانیوں کے پاس ایک ہتھیار دہشت گردی کا ہے۔ جیسا کہ ننکانہ صاحب کے قریب تھانہ صدر کے علاقہ چک نمبر۴ گ ب (بھگوان پورہ) میں قادیانیوں نے ۲۲ سالہ محمد مالک کو شہید کر دیا تھا' جس نے قادیانیوں کی طرف سے ہونے والی توہین رسالت کے خلاف c-۲۹۵ کے تحت مقدمہ درج کروایا تھا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم میں وارد ہوا:

﴿وَيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران:۲۱)

''اور وہ ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو خلق خدا میں سے عدل وراستی کا حکم دیتے ہیں۔''

قادیانی اپنے آپ کو ۱۹۷۴ء سے پہلے والی پوزیشن میں لانے کے لیے آج کل یہ حربہ استعمال کر رہے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خطبات اور تقاریر کے ان اقتباسات کو مسلمان عوام الناس کے سامنے پیش کر رہے ہیں جو اُس نے دعوائے نبوت سے قبل دیے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے اصل میں دو دَور ہیں' ایک ابتدائی دَور ہے جس میں وہ عام مسلمانوں کی طرح عقائد رکھتا تھا' لیکن بعد میں اُس نے اپنے عقائد بدل لیے۔ اس بعد والے دور میں اس نے نبوت اور حیاتِ مسیح کے بارے میں اپنا عقیدہ گھڑ لیا۔ یہ حربہ استعمال کرنے کا اِن قادیانیوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ دوبارہ پہلے والی پوزیشن پر بحالی کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔ جیسا کہ قرآن

حکیم میں فرمایا گیا:

﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴾ (آل عمران)

''اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو شاید (اس ترکیب سے) یہ لوگ (اپنے ایمان سے) پھر جائیں۔''

پریشان کن بات یہ ہے کہ اِس وقت ملک کے کئی کلیدی عہدوں پر قادیانی قابض ہیں' یہاں تک کہ سائنسی تحقیق کے اداروں میں بھی یہ گھسے ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ قادیانی نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں بلکہ یہ ملک وملت کے بھی دشمن ہیں۔لہٰذا جس طرح ایک مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دین کے احیاء کے لیے جدوجہد کرے' اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اُمت میں افتراق وانتشار اور نئے نئے فتنے پیدا کرنے والے افراد اور اداروں سے پوری طرح واقف ہو۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے دو تقاضے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) آنحضورﷺ کے بعد ہر مدّعیٔ نبوت کا قلع قمع کرنا۔

(۲) دین کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانا۔

گویا اگر کوئی شخص اپنے دماغی خلل کی بنا پر دعوائے نبوت کرے تو اس کی سرکوبی کرنا اُمت مسلمہ کے ہر فرد کی بنیادی ذمہ داری ہے' جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مدعیانِ نبوت کے خلاف سرکاری طور پر جہاد کیا۔اسی طرح ہمیں چاہیے کہ رسالت مآبﷺ دین کا جو پیغام لائے اسے دوسروں تک پہنچائیں۔قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تم (مسلمانوں) کو ایک اُمت وسط بنایا ہے تاکہ تم (دنیا کے) لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔''

قیامِ پاکستان کے بعد مسلمانوں کے پاس کتنا سنہری موقع تھا کہ جس وقت قادیانیوں کو کافر قرار دلانے کی کوشش جاری تھی اس کے ساتھ ان کے ارتداد کو بھی خوب عام کیا جاتا' تاکہ اسلام کا قانونِ ارتداد ایک عملی شکل اختیار کرتا' جس سے قادیانیت کا فتنہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو

جاتا۔ چنانچہ اب اگر قادیانی غیر مسلم قرار پانے کے بعد بھی اپنی منفی سرگرمیوں سے باز نہیں آ رہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام کے قانونِ ارتداد کو اپنے قانون کا حصہ بنائیں اور قادیانیوں کو اس کے شکنجے میں جکڑنے کے لیے پرزور کوشش کریں۔

یاد رہے کہ ہم پوری طرح اس قادیانی فتنے کا تب ہی سدّ باب کر سکتے ہیں اگر ہم یہاں اسلامی نظام کا نفاذ کریں۔ اس صورت میں ہم ہر طرح کے فتنے کا آسانی قلع قمع کر سکیں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہ لیا جائے کہ عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے سلسلے میں جاری سرگرمیوں کو نفاذِ اسلام تک معطل کر دیا جائے۔ نہیں، بلکہ ان سرگرمیوں کو مزید تیز اور منظّم کرنے کے بارے میں باقاعدہ منصوبہ بندی کی جائے، تاکہ قادیانیت کے لیے میدان خالی نہ ہو۔

والصَّلاۃُ والسَّلام علی سیّد المرسلین وخاتم النبیین

حواشی

(۱) ابوعمرو الدانی، کتاب التیسیر فی القراءات السبع، ص ۱۷۹۔

(۲) سنن ابن ماجۃ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجال وخروج عیسی ابن مریم و خروج یاجوج و ماجوج، ح۴۰۶۷۔

(۳) راغب اصفہانی، مفردات القرآن، ص ۲۸۶۔

(۴) انور شاہ الکشمیری، اکفار الملحدین والمتأولین فی شیء من ضروریات الدین، ص ۱۱۔

(۵) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین ﷺ، ص۳۲۷۱۔

(۶) ڈاکٹر تنزیل الرحمن، اسلامی قانون ارتداد، ص ۱۳۔

(۷) محمد اسماعیل شجاع آبادی، خطبات ختم نبوت، ج۱، ص ۱۱۷۔

(۸) ابوالحسن علی ندوی، قادیانیت، مطالعہ و جائزہ، ص ۱۴۹۔

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت، اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک جامع خطاب

☆صفحات:72 ☆قیمت :15روپے

فکرِ تنظیم

اتباعِ رسول اکرم ﷺ
قرآنِ حکیم کی روشنی میں

انجینئر نوید احمد

اتباعِ رسول ﷺ ہر مسلمان کے لیے بڑی سعادت ہے۔ اِس سعادت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہم اتباعِ رسول ﷺ کے مفہوم، اِس کی عظمت اور اِس کے مختلف گوشوں کو سمجھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ سے محبت کرنے والوں کی اکثریت اتباعِ رسول ﷺ کی عظمت سے آگاہ ہے لیکن اِس کے گوشوں کے حوالے سے ایک محدود تصور کی حامل ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اتباعِ رسول ﷺ کا مفہوم ہے زندگی کے عام معمولات میں اللہ کے رسول ﷺ کی پیروی کرنا۔ بلاشبہ اِن معمولات میں اللہ کے رسول ﷺ کی پیروی کرنا آپ ﷺ سے محبت کا مظہر اور ہر وقت اللہ کو یاد رکھنے کا بڑا مؤثر ذریعہ ہے۔ البتہ اتباعِ رسول ﷺ کو صرف اِسی حد تک محدود سمجھنا درست نہیں۔ مناسب ہوگا کہ ہم اتباعِ رسول ﷺ کے گوشوں کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

اتباع کا مفہوم

امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن جلد اوّل میں اتباع کے معنی تحریر کیے ہیں ''کسی کے نقشِ قدم پر چلنا''۔ گویا اتباع کے معنی ہیں کسی کے پیچھے چلنا، کسی کے پیچھے پڑ جانا یا معنوی اعتبار سے کسی کی پیروی کرنا۔ یہ پیروی بے لوث محبت کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے اور کسی نفسانی لالچ کے تحت بھی۔ اِن مفاہیم کے حوالے سے چند آیاتِ قرآنیہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) نقشِ قدم پر چلنے کے مفہوم کے اعتبار سے ارشاد ہوا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾﴾ (البقرۃ)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

(۲) اس آیت میں پیچھے چلنے کا مفہوم آیا ہے:

﴿قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾﴾ (طٰہٰ)

''فرمایا (موسیٰ نے) کہ اے ہارون! تمہیں کس چیز نے روکا کہ جب تم نے اُنہیں دیکھا کہ وہ بہک گئے ہیں تو تم کیوں نہیں آئے میرے پیچھے؟ کیا تم نے میری نافرمانی کی؟''

(۳) پیچھے پڑ جانے کا مفہوم یوں بیان ہوا:

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ.....﴾(آل عمران:۷)

''پس وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں کوئی ٹیڑھ ہوتا ہے تو وہ پیچھے پڑ جاتے ہیں اُنہی آیتوں کے جو (انسانی عقل کے اعتبار سے) غیر واضح ہیں.....''

(۴) کسی لالچ کے تحت پیروی کا ذکر اِس طرح آیا:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾﴾ (مریم)

''پھر اُن کے بعد آئے ایسے ناخلف لوگ جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور پیروی کی خواہشات کی، پس وہ عنقریب (بدلہ میں) پائیں گے جہنم کی شدید عذاب والی وادی۔''

(۵) محبت کے ساتھ پیروی کا مفہوم سامنے آتا ہے:

﴿الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾﴾ (الزمر)

''جو لوگ بات کو توجہ سے سنتے ہیں اور پھر اُس کی پیروی کرتے ہیں عمدگی سے، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی اور یہی ہیں عقل مند''۔

اتباعِ رسول ﷺ کا مفہوم ہے نبی اکرم ﷺ کی پیروی کرنا۔ بلاشبہ یہ پیروی وہی سعادت مند کرے گا جسے آپ ﷺ سے محبت ہوگی۔

قرآنِ حکیم میں اتباعِ رسول ﷺ کا ذکر

قرآن حکیم میں اتباع کا لفظ بہت کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ شخصیات، راستے،

کتاب، شریعت یا خواہشات کی پیروی کے لیے آیا ہے۔ یہ لفظ اچھے یا برے دونوں طرح کے کاموں کی پیروی کے لیے آتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی اتباع کے لیے یہ لفظ قرآنِ حکیم میں نو مقامات پر آیا ہے:

(۱) البقرۃ:۱۴۳ (۲) آل عمران:۲۰ (۳) آل عمران:۳۱
(۴) الاعراف:۱۵۷ (۵) الاعراف:۱۵۸ (۶) الانفال:۶۴
(۷) التوبۃ:۱۱۷ (۸) یوسف:۱۰۸ (۹) الشعراء:۲۱۵

مندرجہ بالا مقامات میں سے چار مقامات اتباعِ رسول ﷺ کی اہمیت واضح کرتے ہیں، جبکہ بقیہ مقامات اتباعِ رسول ﷺ کے گوشے نمایاں کرتے ہیں۔

اتباعِ رسول ﷺ کی اہمیت

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (آل عمران)

''(اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

ایمان باللہ کی چوٹی اور معراج یہ ہے کہ انسان کا مطلوب، مقصود اور محبوب اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ بن جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرہ:۱۶۵)

''اور جو لوگ ایمان لائے وہ بہت شدید ہوتے ہیں اللہ سے محبت کے اعتبار سے۔''

سورۂ آلِ عمران کی اِس آیت نے واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا عملی ثبوت ہے اتباع رسول ﷺ۔ جو سعادت مند انسان رسولِ اکرم ﷺ کی اتباع کرے گا اُسے اِس کائنات کی سب سے بڑی دولت مل جائے گی، یعنی اللہ کی محبت اور خوشنودی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ (التوبۃ)

''اور سب سے بڑھ کر ہے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی۔ وہی ہے شاندار کامیابی۔''

اتباعِ رسول ﷺ کے اہتمام سے دوسری رحمت یہ ملے گی کہ اللہ تعالیٰ انسان کے گناہوں کو معاف فرمادے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اتباعِ رسول ﷺ اور اِس کے نتیجہ میں اپنی محبت

اور بخشش کی نعمتیں عطا فرمائے۔ آمین!

اتباعِ رسول ﷺ کی اہمیت کے اعتبار سے دوسری آیت ملاحظہ ہو، جس میں خبر دی گئی :

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (الانفال)

''اے نبی (ﷺ!) اللہ کافی ہے آپؐ کے لیے اور اُن مومنوں کے لیے بھی جو آپؐ کی پیروی کریں۔''

اِس آیت میں بشارت دی گئی کہ جس طرح اللہ اپنے حبیب ﷺ کے لیے تمام شرور، خطرات اور مخالفتوں کے مقابلہ میں کافی ہے اِسی طرح یہ نعمت اُن مومنین کے لیے بھی ہے جو اللہ کے حبیب ﷺ کی اتباع کریں۔ کیا خوب فرمایا مولانا محمد علی جوہرؒ نے :

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے!

اتباعِ رسول ﷺ کی اہمیت کے بیان کے حوالے سے تیسرا مقام، جس میں فرمایا گیا :

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (الشعراء)

''اور آپؐ اپنے کندھے جھکائے رکھیے اُن مومنوں کے لیے جو آپؐ کی پیروی کریں۔''

اِس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو ایسے ساتھیوں کے ساتھ شفقت کا حکم دیا گیا جو آپ ﷺ کی اتباع کرتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ تو وہ خوش نصیب ہستیاں تھیں جنہیں دنیا میں بھی آپ ﷺ کی شفقت کا سایہ ملا اور آخرت میں بھی ملے گا۔ اگر ہم بھی آپ ﷺ کی اتباع کی کوشش کریں تو امید ہے کہ نہ صرف دنیا میں ہمارے معاملات خیر و برکت سے سرفراز ہوں ہوں گے بلکہ ہمیں آخرت میں بھی آپ ﷺ کی شفاعت کی نعمت نصیب ہوگی۔

اتباعِ رسول ﷺ کی اہمیت کے بیان کے حوالے سے چوتھا مقام سورۃ الاعراف کا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (الاعراف)

''تو ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے اُس رسولؐ پر جو کہ نبی اُمی ہے، وہ رسولؐ جو کہ بذات خود ایمان رکھتا ہے اللہ اور اُس کے تمام کلاموں پر، اور اور رسولؐ کی پیروی کرو تا کہ ہدایت پاؤ۔''

اتباعِ رسول ﷺ کے نتیجہ میں انسان نعمت ہدایت سے سرفراز ہوگا۔ بلاشبہ نعمت ہدایت

ہی ہر نعمت کی روح ہے۔ ہدایت ہے تو دنیا کی ہر نعمت واقعی نعمت ہے' ورنہ روزِ قیامت یہ نعمتیں انسان کے لیے پکڑ کا باعث بن جائیں گی۔ مثلاً روپیہ پیسہ اللہ کی نعمت ہے' لیکن اِسی صورت میں کہ انسان ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں اُسے جائز ذرائع سے حاصل کرے اور جائز مدات میں صرف کرے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ جب دریافت فرمائیں گے کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا تو انسان کے لیے جوابدہی مشکل ہو جائے گی اور یہی پیسہ انسان کے لیے ہلاکت بن جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرة :١٩٥)

''اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں مت ڈالو۔''

اتباعِ رسول ﷺ کے گوشے

قرآنِ حکیم میں اتباعِ رسول ﷺ کے چار گوشے نمایاں کیے گئے ہیں :

(١) ذاتی پسند پر اتباعِ رسول ﷺ کو ترجیح دینا

(٢) اللہ کی کامل بندگی کے لیے اتباعِ رسول ﷺ

(٣) دعوتِ دین کے لیے اتباعِ رسول ﷺ

(٤) اقامتِ دین کے لیے اتباعِ رسول ﷺ

نوٹ فرمائیے کہ اللہ کی کامل بندگی' دعوتِ دین اور اقامتِ دین کے لیے جدوجہد ہی ہمارے تین دینی فرائض ہیں۔ گویا قرآنِ حکیم نے دینی فرائض کی ادائیگی کو اتباعِ رسول ﷺ کے گوشوں کے طور پر نمایاں کیا ہے۔

(١) ذاتی پسند پر اتباعِ رسول ﷺ کو ترجیح دینا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾

(البقرة:١٤٣)

''اور ہم نے نہیں مقرر کیا وہ قبلہ جس پر کہ (اے نبیؐ) آپ تھے مگر اِس لیے تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون ہے جو رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اُس کے برعکس جو اپنی ایڑیوں کے بل رُخ پھیر لیتا ہے' اور یقیناً وہ بہت بھاری (حکم) تھا سوائے اُن لوگوں کے جنہیں اللہ

نے ہدایت دی۔“

اِس آیت کے پس منظر میں تحویلِ قبلہ کا واقعہ ہے۔ جب نبی اکرمﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے وحی خفی کے ذریعہ آپﷺ کو حکم دیا کہ نماز کے دوران اپنا رخ بیت المقدس کی طرف رکھیے۔ اِس حکم کا مقصد مہاجر صحابہ رضی اللہ عنہم کا امتحان لینا تھا جنہیں مسجد حرام سے شدید محبت تھی۔ اللہ اُنہیں آزمانا چاہتا تھا کہ آیا وہ اپنی محبت کو ترجیح دیتے ہیں یا اللہ کے رسولﷺ کی اتباع کرتے ہوئے مسجدِ حرام کے بجائے بیت المقدس کو قبلہ بنا لیتے ہیں۔ جب صحابہ کرامؓ اِس امتحان میں سرخرو ہو گئے تو ہجرت کے ۱۶ ماہ بعد تحویلِ قبلہ کا حکم اِن الفاظ میں وارد ہوا :

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ﴾ (البقرة:١٤٤)

”(اے نبیؐ) ہم دیکھ رہے ہیں آپؐ کے چہرے کا بار بار اُٹھنا آسمان کی طرف، پس ہم پھیرے دیتے ہیں آپؐ کے چہرے کو اُس قبلہ کی طرف کہ جس سے آپؐ محبت کرتے ہیں، تو پھیر لیجئے اپنے چہرے (رخ) کو مسجدِ حرام کی طرف، اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں پر بھی ہو پس پھیر لو اپنے چہروں کو اُس (مسجد حرام) کی طرف۔“

(۲) اللہ کی کامل بندگی کے لیے اتباعِ رسولﷺ

سورۂ آلِ عمران میں وارد ہوا :

﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ﴾ (آیت ۲۰)

”(اے نبیؐ) اگر وہ آپؐ سے جھگڑنے لگیں تو فرما دیجئے کہ میں نے تو اپنا چہرہ جھکا دیا ہے اللہ کے سامنے اور ہر اُس فرد نے جس نے میری پیروی کی۔“

نبی اکرمﷺ کا اُسوہ اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی کی کامل عملی مثال ہے۔ آپﷺ کی اتباع کا تقاضا ہے کہ ہم بھی اِسی روش کو ختیار کریں اور ابد الآباد کی نعمتوں سے سرفراز ہو جائیں۔ سورۃ البقرۃ میں بشارت ہے:

﴿بَلٰى ۤ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ١١٢﴾ (البقرة)

''کیوں نہیں! جس کسی نے بھی جھکا دیا اپنا چہرہ اللہ کے لیے تو اُس کا اجر (محفوظ) ہے اُس کے ربّ کے پاس۔ نہ ہی اُن پر کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غم سے دوچار ہوں گے۔''

(۳) دعوتِ دین کے لیے اتباعِ رسول ﷺ

سورۂ یوسف میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ﴾ (آیت ۱۰۸)

''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں بلاؤں اللہ کی طرف' اور اِس حوالے سے میں پوری طرح سے سمجھ بوجھ پر ہوں اور وہ بھی جو کہ میری پیروی کرنے والا ہے''۔

''دعوت الی اللہ'' کا عمل مؤکد ترین سنتِ نبوی ﷺ ہے۔ یہ وہ متفقہ سنت ہے جس پر آپ ﷺ نے ظہورِ نبوت سے لے کر حیاتِ مبارکہ کے آخری سانس تک عمل فرمایا۔

''عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا'' کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے شعور ہے کہ دعوت الی اللہ کا عمل میرے لیے بھی اور مخاطب کے لیے بھی انتہائی خیر کثیر کا حامل ہے۔ مخاطب کو جہنم سے بچا کر جنت میں لے جانے والا اور میرے لیے صدقۂ جاریہ ہے۔

خیر اور بھلائی کے کاموں کے دو درجے ہیں۔ ایک ہے دُنیوی خدمتِ خلق یعنی بھوکوں کو کھانا کھلانا' ضرورت مندوں کا تن ڈھانپنا' بیماروں کی عیادت کرنا اور اُن کے لیے دوا کا انتظام کرنا' لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آنا وغیرہ۔ دوسرا ہے اخروی خدمتِ خلق یعنی لوگوں کو جہنم کی آگ سے بچانے اور اُن کی عاقبت سنوارنے کے لیے اُنہیں نیکی کی تلقین کرنا اور برائی سے روکنا۔ نبی کریم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں خدمتِ خلق کے یہ دونوں پہلو بتمام وکمال دکھائی دیتے ہیں۔ وحی کے آغاز سے قبل آپ ﷺ یتیموں' غریبوں اور محتاجوں کی خدمت کرنے میں پیش پیش تھے۔ پھر جب وحی کے ذریعہ آپ ﷺ پر آخرت کی ابدی زندگی کے حوالے سے حقائق منکشف ہوئے تو آپ ﷺ کی زندگی کا ہر لمحہ خلقِ خدا کو آخرت کی ناکامی سے بچانے کی کوشش میں صرف ہوا۔ آخرت کی حقیقت سامنے ہو تو محض دُنیوی خدمتِ خلق کا تصور بڑا محدود اور ناقص محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہاں ہم کسی بھوکے کے پیٹ کی آگ کو تو بجھا دیں لیکن وہ غفلت کی وجہ سے پورے کا پورا جہنم کی آگ کا نوالہ بن جائے۔ ارشادِ

نبوی ﷺ ہے :

((اَنْتُمْ تَتَهَا فَتُوْنَ كَتَهَا فَةِ الْفَرَاشَةِ عَلَى النَّارِ وَاَنَا اٰخِذٌبِكُمُ الْحُجَزَ))

''تم تو آگ میں اِس طرح گرے پڑتے ہو جیسے پروانے گرا کرتے ہیں اور میں تم کو کمر سے پکڑ پکڑ کر جہنم سے پرے ہٹا رہا ہوں''۔(العراقی)

اتباعِ رسول ﷺ کا تقاضا ہے کہ جہاں ہم اپنی امکانی حد تک دکھ درد میں لوگوں کے کام آسکیں، وہیں ہم پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ اُن کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے دعوت الی اللہ کے مشن میں مال اور جان لگانے پر کمر بستہ ہو جائیں۔

(۴) اقامتِ دین کے لیے اتباعِ رسول ﷺ

سورۃ التوبۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کی تحسین فرمائی :

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾﴾

''بیشک اللہ نے نبی (ﷺ) پر مہربانی کی اور اُن مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے نبیؐ کی پیروی کی (غزوہ ٔتبوک کی) مشکل گھڑی میں، باوجود اِس کے کہ اُن میں سے بعضوں کے دل پھر جانے کو تھے، پھر اللہ نے اُن پر مہربانی فرمائی۔ بیشک وہ اُن پر نہایت شفقت کرنے والا (اور) مہربان ہے۔''

اقامتِ دین کی جدوجہد کے دوران غزوۂ تبوک نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا آخری اور مشکل ترین معرکہ تھا۔ اِس موقع پر مسلمانوں کو انتہائی شدید آزمائش کا مرحلہ درپیش تھا، جس کے مظاہر یہ ہیں :

(۱) اُس وقت دنیا میں دو بادشاہتوں کو بڑی طاقتیں تسلیم کیا جاتا تھا، یعنی سلطنتِ ایران اور سلطنتِ روما۔ غزوۂ تبوک میں وقت کی ایک بڑی طاقت سلطنتِ روما کے ساتھ ٹکراؤ تھا۔

(۲) موسم گرمیوں کا تھا اور گرمی بھی پوری شدت پر تھی۔ منافقین، مؤمنین سے کہہ رہے تھے: ﴿لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ﴾ ''مت نکلنا گرمی میں''، اور اللہ فرما رہا تھا: ﴿نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ﴾ ''جہنم کی آگ کہیں زیادہ شدید ہے گرمی کے اعتبار سے''۔(سورۃ التوبۃ:۸۱)

(۳) سفر انتہائی طویل تھا۔ تبوک کا فاصلہ مدینہ سے تقریباً سات سو کلومیٹر ہے۔

(۴) سواریوں کی کمی تھی اور اٹھارہ ساتھیوں کو باری باری ایک اونٹ پر سفر کرنا پڑتا تھا۔

(۵) خوراک کی کمی کا یہ عالم تھا کہ دو ساتھیوں کو روزانہ ایک کھجور پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ بسا اوقات درختوں کی پتیاں استعمال کرنی پڑتی تھیں جس سے ہونٹوں میں ورم آ گیا تھا۔ مجبوراً قلت کے باوجود اونٹوں کو نحر کرنا پڑتا تا کہ نہ صرف اُن کا گوشت کھایا جا سکے بلکہ پانی کی کمی کی وجہ سے اُن کے معدے اور آنتوں کے اندر جمع شدہ پانی اور تری سے پیاس بجھائی جا سکے۔

(۶) مدینہ میں کھجور کی فصل تیار ہونے کے قریب تھی۔ اگر فصل کو بروقت اتارا نہ جائے تو وہ درخت کے اوپر ہی ضائع ہو جاتی ہے۔ اب جبکہ مرد سفر پر جا رہے تھے تو پیچھے خواتین کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ کھجور کی فصل اُتار سکیں۔ اِس فصل کے ضائع ہونے کی صورت میں آئندہ کے لیے بھی خوراک کی قلت کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

مذکورہ بالا مشکلات کی وجہ سے غزوۂ تبوک کو ''جیش العسرۃ'' کہا جاتا ہے۔ دورِ نبوی ﷺ میں یہ واحد موقع تھا کہ اِس میں نفیرِ عام کا حکم دیا گیا۔ ہر مسلمان سے کہا گیا کہ وہ اللہ کی راہ میں نکلے۔ اگر کوئی عذر لاحق ہے تو نبی اکرم ﷺ سے رخصت حاصل کرے۔ مزید یہ کہ ہر مسلمان سے کہا گیا کہ وہ اِس موقع پر جو بھی مال اللہ کی راہ میں دے سکتا ہے پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت میں اُن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تحسین فرمائی جنہوں نے سفرِ تبوک کی مشکل گھڑیوں میں نبی اکرم ﷺ کا ساتھ دیا۔

اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انتہائی کٹھن جدوجہد کے ذریعہ نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں دین غالب کیا بلکہ بیرونِ ملکِ عرب اُس کی توسیع کا آغاز بھی کر دیا۔ دورِ نبوی ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دنیا کے وسیع حصہ میں اسلام کا جھنڈا لہرا دیا، بقولِ اقبال :

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

لیکن رفتہ رفتہ دنیا میں اسلام مغلوب ہوتا چلا گیا اور آج دنیا میں کہیں بھی اسلام غالب نہیں ہے۔ بقول الطاف حسین حالی :

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اور ؎

اے خاصہ ء خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے!

اتباعِ رسول ﷺ کا تقاضا ہے کہ ہم دین کے غلبہ کے لیے مال و جان سے جہاد کریں۔ یہ صرف اتباعِ رسول ﷺ ہی نہیں اتباعِ صحابہؓ کا بھی تقاضا ہے' اور ایسا کرنے والوں کے لیے سورۃ التوبہ میں بشارت ہے :

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

''اوّل اوّل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی عمدگی کے ساتھ' راضی ہو گیا اُن سے اللہ اور وہ راضی ہو گئے اللہ سے' اور تیار کر رکھے ہیں اللہ نے اُن کے لیے وہ باغات جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں' وہ رہیں گے اُن باغات میں ہمیشہ ہمیش۔ یہی ہے شاندار کامیابی''۔

اتباعِ رسول ﷺ کے حوالے سے جامع ترین آیت

اتباعِ رسول ﷺ کے حوالے سے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ پورے قرآنِ مجید کی جامع ترین آیت ہے۔ سیاقِ کلام کے اعتبار سے اِس آیت میں اُن خوش نصیبوں کا ذکر ہے جو اللہ کی رحمتِ خاص کے حق دار ہوں گے۔ فرمایا :

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ

كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۱۵۷﴾

''(اللہ کی رحمتِ خاص اُن کے لیے ہے) جو پیروی کریں گے اُن رسول ﷺ کی جو نبی اُمی ہیں اور جن کا ذکرِ مبارک وہ لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں۔ وہ اُنہیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کام سے روکتے ہیں' اور پاک چیزوں کو اُن کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام ٹھہراتے ہیں' اور اتارتے ہیں اُن (کے سر اور گردن) پر سے وہ بوجھ اور طوق جو اُن پر موجود تھے۔ تو جو لوگ اُن پر ایمان لائے اور اُن کی توقیر و تعظیم کی اور اُن کی مدد کی اور پیروی کی اُس نور کی جو اُن کے ساتھ نازل کیا گیا' وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔''

اِس آیتِ کریمہ میں اوّل و آخر اتباع کا ذکر ہے۔ ابتدا میں رسولِ اکرم ﷺ کی اتباع کا ذکر ہے اور آخر میں نورِ ہدایت یعنی قرآنِ حکیم کی اتباع کا۔

اتباعِ رسول ﷺ کے حوالے سے اِس آیت میں تین گوشے بیان کیے گئے ہیں :

(۱) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

(۲) حلال و حرام کی تمیز

(۳) مشرکانہ و جاہلانہ عقائد و اعمال سے اجتناب

(۱) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

سورۂ آل عمران میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اِس امت کا مقصد اور فرضِ منصبی قرار دیا گیا :

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۱۰)

''تم بہترین اُمت ہو جسے اللہ نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے اٹھایا ہے' تم نیکی کا حکم دیتے ہو' برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

اگر امت اِس ذمہ داری سے پہلو تہی کرے گی تو گویا اپنے مقصد کو چھوڑ دے گی اور اللہ کی طرف سے سزا کی مستحق ٹھہرے گی۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ

اَوْلَیُوْشِکَنَّ اللّٰہُ اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عِقَابًا مِنْہُ، ثُمَّ تَدْعُوْنَہٗ فَلاَ یُسْتَجَابُ لَکُمْ))(ترمذی)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ضرور نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب نازل کرے گا، پھر تم اُس سے دُعا کرو گے تو تمہاری دُعا قبول نہ ہوگی۔''

اگر اُمت بحیثیت مجموعی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اِس کے لیے رہنمائی بایں الفاظ موجود ہے:

﴿وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران)

''تم میں سے ایک جماعت تو لازماً ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اِس آیت کی رو سے فلاحِ اخروی کے حصول کے لیے کسی ایسی اجتماعیت میں شامل ہونا ضروری ہے جو دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہو۔

(۲) حلال وحرام کی تمیز

نبی اکرم ﷺ نے قرآنِ حکیم اور اپنے ارشادات کے ذریعہ ہمیں مال، خوراک، لباس اور جنسی جذبات کی تسکین کے حوالے سے حلت وحرمت کے احکامات دیے ہیں۔ آپ ﷺ کی اتباع کا تقاضا ہے کہ ہم اِن احکامات کی سختی سے پابندی کریں۔

(۳) مشرکانہ وجاہلانہ عقائد واعمال سے اجتناب

اتباعِ نبوی ﷺ کا تیسرا گوشہ ہے اُن بوجھوں سے خود کو اور نوعِ انسانی کو آزاد کرانا جو مشرکانہ عقائد واوہام، بدعات اور رسومات کی صورت میں وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ مشرکانہ عقائد کی وجہ سے لوگوں کو شدید ذہنی وجسمانی مشقتیں اور مالی نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔ مشرکانہ اوہام کی وجہ سے معبودانِ باطل یا دیگر اسبابِ دنیوی کا خوف طاری ہوتا ہے اور بعض اوقات اُس کے لیے مال، اولاد اور مویشیوں کی بھینٹیں چڑھانی پڑتی ہیں۔ نام نہاد مذہبی پیشوا بندے اور خالق کے درمیان واسطے اور وسیلے بن کر نذرانوں کی صورت میں بندوں کا خون چوستے ہیں۔ خوشی کے موقع پر رسومات کے طومار اور غمی کے موقع پر بدعات کی وجہ سے

غریبوں پر ایسا مالی بوجھ پڑتا ہے کہ اُن کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں۔ اگر آپ ﷺ کی تعلیمات اور سنتوں پر عمل کیا جائے تو اِن بوجھوں اور گردن کے اِن طوقوں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

اِس آیت میں اتباعِ رسول ﷺ کے حوالے سے بیان کیے گئے تین گوشوں کے حوالے سے ہماری اکثریت کا طرزِ عمل افسوسناک ہے۔ ہم ٹوپی اور ڈاڑھی کے حوالے سے تو اتباعِ رسول ﷺ کرتے ہیں، لیکن امر بالمعروف ونہی عن المنکر تو کجا ہمارے گھروں میں ٹیلی ویژن اور اخبارات وجرائد کے ذریعہ بے حیائی اور برائی کی ترویج ہو رہی ہوتی ہے۔ حلال حرام کی تمیز تو دور کی بات ہے، ہم کماتے حرام ذرائع سے ہیں لیکن رزقِ حرام کو کھاتے مسنون طریقہ سے ہیں۔ لباس مسنون پہنتے ہیں لیکن باطل نظام کا حصہ بن کر اُس کی چاکری کرتے ہیں۔ ظاہری اعتبار سے سنت پر عمل ہوتا ہے لیکن بدعات اور رسومات میں پیروی آباء واَجداد کی ریتوں اور برادری کے رواج کی ہو رہی ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں اتباعِ رسول ﷺ کے حوالے سے آپ ﷺ سے تعلق کی چار بنیادیں بیان ہوئیں، یعنی آپ ﷺ پر نہ صرف زبان بلکہ دل سے ایمان لانا، آپ ﷺ کا ادب واحترام کرنا، دعوتِ دین اور اقامتِ دین کے مشن کے لیے تن من دھن لگا کر آپ ﷺ کی نصرت کرنا اور آپ ﷺ پر نازل ہونے والے نورِ ہدایت یعنی قرآنِ حکیم کی پیروی کرنا۔ ایسا کرنے والوں کو آیت کے آخر میں کامیاب ہونے کی بشارت دی گئی۔

خلاصۂ کلام

قرآنِ حکیم نے اتباعِ رسولِ اکرم ﷺ کے جو گوشے نمایاں کیے ہیں اُن کا تعلق ہماری اُن دینی ذمہ داریوں سے ہے جن کا ادا کرنا انتہائی کٹھن ہے۔ اِس کے برعکس محدود مذہبی تصور کے تحت ہم نے اتباعِ رسول ﷺ کے گوشے کو محض نشست و برخاست، خورد ونوش اور چلنے پھرنے وغیرہ تک محدود کر دیا۔ جو شخص صرف اِن امور میں آپ ﷺ کی پیروی کر رہا ہو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کا سچا عاشق ہے، لیکن جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح دین کی خدمت کے لیے مال وجان کی قربانیاں دے رہا ہو ہم اُسے اتباعِ رسول ﷺ پر عمل پیرا نہیں سمجھتے ع

ببیں تفاوتِ رہ، از کجاست تا بہ کجا!

۞۞۞

افکار و آراء

پاکستان کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت
قرآن و حدیث کے آئینے میں

طارق اسماعیل ملک ☆

اِس وقت مملکت خداداد پاکستان جن سنگین حالات سے گزر رہی ہے اور جس طرح مصائب و ابتلاء کا شکار ہے' اس سے ایک عامی شخص بھی خوب واقف ہے اور خون کے آنسو روتا ہے۔ اس مملکت خداداد پر اوپر سے بھی مصائب نازل ہو رہے ہیں اور نیچے سے زمین بھی تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ امریکہ مسلسل اس پاک سرزمین کو روندرہا ہے اور میزائل برسا رہا ہے۔ حالیہ اخباری رپورٹوں کے مطابق اس نے فضائی حملوں میں شدت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب تک تقریباً بارہ لاکھ پاکستانی بے گھر ہو چکے ہیں۔ دہشت گردی کی اس نام نہاد جنگ میں ہمارے اپنے حکمران بھی شریک ہیں اور ہماری اپنی افواج اپنے ہی علاقوں میں فوجی کارروائیاں کر رہی ہیں۔ دوسری طرف پاکستان اِس وقت شدید معاشی بحران کا شکار ہے۔ آٹا' بجلی' پانی' گیس جو بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں' عوام کی پہنچ سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔ اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں عام آدمی تو کجا متوسط گھرانوں کی دسترس سے بھی باہر ہیں۔ اور اب تو بینکوں کی ابتر مالی صورتِ حال سے مزید معاشی بحران کا شدید خطرہ ہے۔ مختصر یہ کہ پاکستانی قوم ایک انتہائی غیر یقینی اور خوف و الم کی صورتِ حال سے گزر رہی ہے۔ طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ اس بحرانی صورت حال سے نکلنے کی بھی کوئی منصوبہ بندی نہیں ہو رہی اور ہر ادارہ دوسرے ادارے اور ہر فرد دوسرے فرد پر اس کا الزام دھر رہا ہے۔

مزید برآں کوئی بھی یہ سوچنے تک کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس تمام بحرانی کیفیت کا اصل سبب کیا ہے اور اس سے نکلنے کی راہ کیا ہے۔ اس ملک کا ہر ہر فرد' الّا ماشاء اللہ' اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہے اور غلط راہ پر چل رہا ہے۔ اس ناگفتہ بہ صورت حال کو ذرا آئینۂ قرآنی میں دیکھئے:

☆ ادارتی معاون شعبہ مطبوعات' قرآن اکیڈمی لاہور

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴿۴۱﴾ ﴾ (الروم)

''خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے' تاکہ اللہ تعالیٰ مزا چکھائے ان کو اُن کے اعمال کا' شاید کہ وہ باز آئیں۔''

گویا آج جو ہم بیرونی حملوں اور خانہ جنگی کی زد میں ہیں اور معاشی بحران کا شکار ہیں تو قرآن کی رو سے یہ سب ہمارے اپنے کرتوتوں کی سزا ہے۔ اگر ہم اپنے اِن سیاہ اعمال سے باز آ جائیں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حالات سنوار دے گا۔ ایک اور جگہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی﴿۱۲۴﴾ ﴾(طٰہٰ)

''اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں زندگی تنگ ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔''

یہ فرمانِ الٰہی بھی آج ہمارے اوپر صد فی صد صادق آ رہا ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات سے روگردانی کی اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی منع کردہ چیزوں میں منہ مارا' بے عملی و بدعملی کا شیوہ اختیار کیا' لہٰذا آج زمین اپنی تمام تر کشادگی کے باوجود ہمارے لیے تنگ پڑ گئی ہے اور آسمان سے اس کی رحمت کے نزول کے بجائے میزائل برس رہے ہیں۔ کیونکہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کے حق دار نہیں رہے۔ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) نے جب اللہ اور اس کے رسولوں کے احکامات کو ترک کر کے سیاہ کاریاں کیں' شریعت کو توڑا تو ان پر بھی زمین تنگ ہوگئی' جیسے آج ہمارے لیے ہو رہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ﴾ (المائدۃ:٦٦)

''اور اگر انہوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اُن کے ربّ کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں تو ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی ابلتا۔''

موجودہ حالات میں ہمارے لیے بھی اللہ تعالیٰ کا یہی فیصلہ ہے کہ اگر تم قرآن پر عمل کرو

گے‘ اس کا دیا ہوا نظام قائم و نافذ کرو گے تو ہم تمہارے حالات بہتر کر دیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے‘ جو تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿٤٣﴾﴾ (فاطر)

’’پس تم ہرگز نہیں پاؤ گے اللہ کی سنت کو تبدیل ہوتا ہوا۔ اور تم ہرگز نہیں پاؤ گے اللہ کی سنت کو ٹلتا ہوا۔‘‘

آج ہم جن حالات سے دوچار ہیں‘ ان کا نقشہ ایک حدیثِ نبویؐ میں ملتا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا فَعَلَتْ اُمَّتِیْ خَمْسَ عَشْرَةَ خَصْلَةً حَلَّ بِهَا الْبَلَاءُ)) فَقِيْلَ مَا هُنَّ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((اِذَا كَانَ الْمَغْنَمُ دُوَلًا ، وَالْاَمَانَةُ مَغْنَمًا، وَالزَّكَاةُ مَغْرَمًا، وَاَطَاعَ الرَّجُلُ زَوْجَتَهُ ، وَعَقَّ اُمَّهُ ، وَبَرَّ صَدِيْقَهُ ، وَجَفَا اَبَاهُ، وَارْتَفَعَتِ الْاَصْوَاتُ فِی الْمَسَاجِدِ، وَكَانَ زَعِيْمُ الْقَوْمِ اَرْذَلَهُمْ، وَاُكْرِمَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهٖ، وَشُرِبَتِ الْخُمُوْرُ، وَلُبِسَ الْحَرِيْرُ، وَاتُّخِذَتِ الْقَيْنَاتُ وَالْمَعَازِفُ، وَلَعَنَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا فَلْيَرْتَقِبُوْا عِنْدَ ذٰلِكَ رِيْحًا حَمْرَاءَ اَوْخَسْفًا اَوْ مَسْخًا)) (سنن الترمذی‘ کتاب الفتن عن رسول اللّٰہ ﷺ‘ باب ما جاء فی علامة حلول المسخ والخسف)

’’جب میری اُمت میں پندرہ خصلتیں در آئیں گی تو یہ مصائب و آلام کا شکار ہو جائے گی‘‘۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ خصلتیں کون کون سی ہوں گی؟ آپؐ نے فرمایا: ’’جب سرکاری مال کو ذاتی ملکیت سمجھا جانے لگے گا‘ امانت کو مالِ غنیمت سمجھا جانے لگے گا‘ زکوٰۃ کو جرمانہ سمجھا جانے لگے گا‘ آدمی اپنی بیوی کی تو فرماں برداری کرے گا مگر اپنی ماں کی نافرمانی کرے گا‘ اور اپنے دوست کو تو عزت و اکرام سے نوازے گا مگر اپنے والد سے قطع تعلق کر لے گا‘ مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں گی‘ رذیل ترین لوگ قوم کے حکمران ہوں گے‘ کسی آدمی کی عزت اُس کے شر کے خوف کے سبب ہونے لگے گی‘ شراب پی جانے لگے گی اور ریشم کے لباس پہنے جانے لگیں گے‘ گانے بجانے والیاں بلائی جانے لگیں گی اور اِس اُمت کے بعد میں آنے والے لوگ اپنے سے پہلے والوں پر لعن طعن کریں گے۔ پس جب یہ حالات ہوں تو لوگوں کو اللہ کی طرف سے عذاب کے لیے تیار رہنا چاہیے‘ چاہے وہ سرخ آندھی کی شکل میں ہو‘ زمین کے

دھنس جانے کی شکل میں ہو یا شکلوں کے مسخ ہو جانے کی شکل میں ہو‘‘۔

آج یہ حدیث نبویؐ ہمارے حالات پر پوری طرح منطبق ہو رہی ہے۔ سرکاری مال‘ جو عوام کی فلاح و بہبود اور خوشحالی پر خرچ ہونا چاہیے‘ اسے آج افسران بالا اور ہمارے حکمران اپنا ذاتی مال سمجھ رہے ہیں اور اپنے بینک بیلنس بڑھا رہے ہیں۔ سرکاری املاک حکمرانوں اور عہدے داروں کے پاس امانت ہیں لیکن وہ انہیں مالِ غنیمت سمجھ کر اپنے مقربین کو نواز رہے ہیں۔ عوامی سطح پر بھی خوب امانت میں خیانت ہو رہی ہے۔ صاحب خیر لوگ‘ جن پر زکوٰۃ فرض ہے‘ اسے جرمانہ اور بوجھ سمجھ کر منحرف ہو رہے ہیں۔ آج شوہر حضرات اپنے بیوی بچوں کے لیے جائز و ناجائز کی تمیز سے بے پروا ہو رہے ہیں اور ان کی خاطر اپنی ماؤں کی نافرمانی پر اتر آتے ہیں۔ آدمی اپنے دوستوں کی خاطر اپنے والد سے قطع تعلق کر رہے ہیں۔ کئی لوگوں کے منہ سے یہ سننے میں ملا ہے کہ میں والدین کو تو چھوڑ سکتا ہوں مگر دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مساجد میں عبادت کم اور ذاتی گفتگو اور شور شرابا زیادہ ہوتا ہے۔ آج ہمارے اوپر وہ لوگ حکمران ہیں جو اسلام کی مبادیات تک سے ناواقف ہیں۔ یہود و نصاریٰ سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ ’’یہ ہمارے دوست ہیں‘‘۔ حالانکہ قرآن نے واضح طور پر فرما دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ‘ یہ اصل میں تمہارے دشمن ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۱﴾﴾ (المائدۃ)

’’اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ۔ یہ باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جس نے بھی ان سے دوستی کی تو وہ انہی میں سے ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔‘‘

ہمارے حکمرانوں کے کرتوت ان کے دورِ حکومت میں تو بہت حد تک چھپے ہی رہتے ہیں‘ مگر ان کے جانے کے بعد ان کی سیاہ کاریاں جو تھوڑی بہت منظر عام پر آتی ہیں تو قوم کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ ہمارے موجودہ صدر صاحب پر حکومت میں آنے سے پہلے کرپشن اور لوٹ مار کے کافی مقدمات تھے۔

آج ایسے لوگ بہت کم ہیں جو حقیقی معنوں میں قابل عزت و احترام ہوں۔ پھر ہماری

ترجیحات بھی بدل گئی ہیں۔ ہم کسی کے تقویٰ اور بزرگی کی بنا پر اُس کی عزت اور احترام نہیں کرتے' ہاں شریر اور دولت مندوں اور کرپٹ لوگوں کو عزت سے ضرور نوازتے ہیں۔ آج نشہ آور چیزوں کا لوگ بے دھڑک استعمال کرنے لگے ہیں' اور وہ وقت اب قریب نظر آ رہا ہے کہ لوگ کھلم کھلا ایسی چیزوں کا استعمال کریں' جیسے یورپ اور دیگر ممالک میں ہو رہا ہے۔ آلاتِ موسیقی اور گانوں کا کلچر عام ہے۔ ہمارے معاشرے میں جن لوگوں کو گویّے' مراثی' بہروپیے اور بھانڈ کہا جاتا تھا اور جنہیں معاشرے کے رذیل افراد سمجھا جاتا تھا وہ اب ہمارے ثقافتی سفیر بنے ہوئے ہیں اور اپنے فن سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی خوب نمائندگی کر رہے ہیں۔ اِس دَور میں لوگ اسلاف کو نعوذ باللہ دقیانوسی اور ''بس پرانے زمانے کے لوگ'' کہتے ہیں۔

آج یہ ساری قباحتیں اور برائیاں ہمارے اندر یعنہٖ ایک ایک کر کے موجود ہیں اور ہمارے نبی اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ جب یہ برائیاں میری اُمت میں در آئیں گی تو پھر لوگوں کو چاہیے کہ وہ عذابِ الٰہی کے لیے تیار رہیں خواہ اس کی شکل کوئی سی بھی ہو۔ اعاذنا اللّٰہ من ذلك!!